کتابچہ لکھنے کی غرض و غایت

سانجھ کے ممبران کی ابتدائی تعلیم کے سلسلے کی یہ دوسری کتاب ہے۔ اس کا مقصد پاکستان کے معاشی سسٹم اور اس کے اوپری ڈھانچے یعنی سیاسی نظام کو سمجھنا ہے جسے ہم مقامی کے ساتھ ساتھ بین الاقوامی معاشیات سے جوڑ کر دیکھیں گے۔ عنوان کے لحاظ سے تو یہ کتابچہ معاشیات کا موضوع ہے مگر اسے کہانی کی صورت میں بیان کیا گیا ہے تاکہ کسی کا زیادہ پڑھے لکھے نہ ہونے کا بہانہ کتابچہ کو سمجھنے میں رکاوٹ نہ بن پائے۔

یہ کتابچہ پاکستان کے متعلق 101 سوالوں کا جواب ہے۔ کالونیل ازم، سامراجیت یا نوآبادیاتی نظام کا ذکر نصاب کی کتابوں میں ایک منصوبہ بندی کے تحت نہیں کیا جاتا۔ اس سے حکمرانوں کو پاکستان کے تعلیم یافتہ طبقے کو حقائق سے بے خبر رکھنے میں مدد ملتی ہے اور ہمیں حالات سے نظر چرانے میں مدد ملتی ہے۔ مگر کب تک؟ پاکستان کی بیوروکریسی کی تکون میں عدلیہ کی آزادی سے دراڑ پڑ چکی ہے۔ کالونیل سسٹم کے حفاظتی قلعہ کی دیوار میں اس دراڑ سے تبدیلی کی جو ہوا داخل ہوگی وہ بالآخر تبدیلیوں کا ایک سلسلہ بنتے بنتے پاکستانی عوام کے لیے بار آور ثابت ہوگی۔

کالونیل ازم کو سمجھنا۔ اس کی پوری تاریخ اور ارتقائی مراحل کو جاننا۔ اس کے مدمقابل غلامی سے نجات حاصل کرنے کی حکمت عملی ترتیب دے کر اس پر محنت کش طبقے کو منظّم کرنا سانجھ کا بنیادی محوری کام ہے۔ اسی وجہ سے سانجھ نے 29 مارچ کو اپنا یوم تاسیس بنایا تھا کیونکہ پنجاب پر کالونیل راج کا آغاز 29 مارچ 1849ء کو ہوا۔

سامراج محض خارجی چیز نہیں بلکہ مقامی حکمران طبقات کے مفادات بھی سامراج سے ہم آہنگ ہوتے ہیں۔ تعلیم۔ میڈیا اور رائے عامہ ہموار کرنے کے تمام ذرائع بشمول

Sanjh Lok Raj

مذاہب مقامی حکمران طبقے کے کنٹرول میں ہوتے ہیں۔ جن کے ذریعے حکمران طبقہ اپنے اور سامراجی مفادات کا دفاع کرتا ہے۔ حکمرانی کرنے والی سیاسی پارٹیاں خود کو کسی پروگرام پر منظّم نہٰں کرتیں بلکہ خود کو موروثی سیاست اور شخصیات کے گرد بے ترتیب ہجوم تک محدود رکھتی ہیں تا کہ سیاست کا رخ کسی بڑی تبدیلی کی بجائے مقامی مسائل کے حل تک محدود رہے۔

کالونیل معاشی پالیسیوں کا سب سے زیادہ نقصان محنت کش طبقے کو ہوتا ہے۔ محنت کش طبقے کو سیاست سے دور رکھنے کے لیے قومی اور بین الاقوامی سطح پر بہت بھاری رقوم خرچ کی جاتی ہیں کیونکہ محنت کش طبقے کے پاس سامراجی غلامی سے نجات حاصل کرنیکے لیے خود سیاست میں حصہ لینے کے سوا کوئی چارہ نہیں۔ جب بھی کوئی محنت کش اپنی غربت۔ بیروزگاری۔ جہالت۔ بیماریوں۔ بے گھری۔ تھانوں میں بے حرمتی کی وجہ دریافت کرنے کی کوشش کرے گا تو اسے اپنا دشمن کالونیل سسٹم ہی نظر آئے گا۔ اس لیے حکمران طبقہ ہر ممکن کوشش کرتا ہے کہ لوگ باشعور نہ ہوں۔ محنت کش جب بھی سیاست کرے گا وہ قدرتی طور پر سامراج دشمن سیاست ہوگی۔ اس لیے سانجھ محنت کش طبقے میں طبقاتی شعور بیدار کر کے انہیں سیاسی عمل میں بھرپور شرکت پر آمادہ کرنے ہی کو سماجی تبدیلی کا واحد ذریعہ سمجھتی ہے۔

محمد مسعود خالد

0300-6943894

Sanjh Lok Raj

پسماندگی کی مادی وجوہات

ہماری درس گاہیں، میڈیا، کلچر، حکمران طبقے اور مخصوص اشاعتی ادارے بڑے زور شور سے ہماری پسماندگی کی روحانی وجوہات بیان کرتے چلے آ رہے ہیں۔ مگر پسماندگی کی مادی وجوہات پر بہت کم لکھا گیا ہے۔ سائنسی علم کے عروج کے آج کے زمانے میں رونما ہونے والی کسی بھی تبدیلی کی مادی وجوہات دریافت کرنے کی اہمیت بہت بڑھ گئی ہے۔

مادی وجوہات کی مثال اس طرح ہے کہ ایک درخت آندھی کے زور سے گر جاتا ہے اور آس پاس کے درخت نہیں گرتے۔ ظاہر ہے آپ کا تجسس آپ کو وجہ دریافت کرنے پر مجبور کرتا ہے کہ آخر یہ ایک ہی درخت کیوں گرا؟ کھوج لگانے پر پتہ چلتا ہے کہ اس درخت کی جڑوں کو دیمک نے کھا لیا تھا۔ جس کی وجہ سے اس کی جڑیں زمین میں اپنی پکڑ قائم نہیں رکھ سکیں۔ درخت کے گرنے کی دو وجوہات کا پتہ چلا۔ ایک تو آندھی جو ظاہری وجہ نظر آتی ہے اور دوسری کمزور جڑیں جو حقیقی وجہ ہے۔ یہ دونوں وجوہات مادی وجوہات کہلائیں گی۔ کیونکہ ہر شخص ان دونوں وجوہات کا مشاہدہ کر سکتا ہے اور اس سے پیدا ہونے والے نتیجے کو بھی دیکھ سکتا ہے۔ اس سے آگے بڑھیں تو اس خاص درخت کو دیمک لگنے کی مادی وجوہات کو بھی معلوم کیا جا سکتا ہے۔ یہ سلسلہ دریافت مادی تجزیہ کہلاتا ہے۔ اس کے برعکس ہمارے کلچر میں درخت گرنے کی وجہ ناپاک عورت کا سایہ پڑنا بھی بتائی جاتی ہے۔

مادی وجوہات کی دریافت ایک حواسی علم ہے۔ یعنی ایسی بات جس کی شہادت ہمارے پانچ حواس دیں۔ اس کو سمجھنے کے لیے ایک واقعہ بیان کرنا ضروری ہے۔ ایک دفعہ علم کی قسموں پر سٹڈی سرکل ہو رہا تھا کہ دنیا میں دو ہی قسم کے علوم ہیں۔ ایک حواسی اور دوسرے قیاسی۔ اس سٹڈی سرکل میں سولہ سامعین شریک تھے۔ مقرر نے تمام حاضرین کے نام بلیک

Sanjh Lokraj

بورڈ پر لکھے اور اس کے آگے ایک لکیر کھینچ کر سب سے یہ مشترکہ سوال کیا کہ آپ کے دائیں بازو کمرے کی جو دیوار ہے، اس کے پیچھے کیا ہے؟

اب سولہ کے سولہ لوگوں نے قیاس کی طاقت آزمائی اور جواب دیئے۔ مقرر نے ہر ایک کا جواب اس کے نام کے آگے لکھ دیا۔ کسی نے کہا اُدھر دوسرا کمرہ ہے۔ دوسرے نے کہا ادھر سڑک ہے۔ کسی نے کہا کھیت ہیں تو کسی نے اندازہ لگایا کہ ادھر کار کا گیراج ہے۔ اس طرح سولہ کے سولہ جواب مختلف تھے۔ یہ سولہ قیاسی جوابات تھے۔

اب مقرر نے ان جوابات کے آگے ایک اور لیکر کھینچی اور مستری کو بلا کر دیوار سے چند اینٹیں نکال کر جھروکہ بنا دیا۔ پھر سب کو دکھایا کہ اس دیوار کے پیچھے کیا ہے۔ دیوار کے پیچھے پرنٹنگ پریس تھا۔ اب جب دوبارہ سوال کیا گیا تو سولہ کے سولہ شرکا نے ایک ہی جواب دیا۔ پرنٹنگ پریس۔

اب بلیک بورڈ پر سولہ ناموں کے آگے قیاسی کے خانے میں 16 جوابات اور حواسی کے خانے میں ایک ہی جواب تھا۔ جس سے مقرر کو یہ ثابت کرنے میں آسانی ہوئی کہ قیاس ہر شخص کا الگ الگ ہوسکتا ہے۔ ہر شخص اپنا قیاس بدل بھی سکتا ہے۔ مگر مشاہدہ سب کو ایک ہی چیز پر متفق کرتا ہے۔ مادی وجوہات کی دریافت ایک حواسی علم ہے۔ کئی ممالک میں فی ایکڑ پیداوار کم اور کئی دوسرے ممالک میں فی ایکڑ پیداور بہت زیادہ ہوتی ہے۔ اس کا انحصار بیج کی کوالٹی، زرعی ٹیکنالوجی، کھادوں کا استعمال اور موسمی حالات پر ہے۔ یہی عوامل جو پیداور کی کمی یا کثرت کا فیصلہ کرتے ہیں مادی وجوہات کہلاتی ہیں۔ اس طرح مختلف ممالک میں انسانوں کی اوسط عمر مختلف ہے جیسے پاکستان میں 45 سال برطانیہ میں 72 سال اور چین میں 110 سال۔ اس کے پس پشت بھی مادی وجوہات ہیں۔

جس طرح مادی وجوہات قیاس پر مبنی نہیں ہوتیں اس طرح وہ انسانی خواہشات کے تابع بھی نہیں ہوتیں کہ دل چاہا تو بدل دیں۔ بلکہ قوانین فطرت کے تابع ہوتی ہیں مثال کے طور پر ایک شخص پہاڑ کی چوٹی پر کھڑا ہے اور اس کا بھائی پہاڑ کے دامن میں ہے۔ ایک پتھر اوپر والے شخص کے پاؤں سے لڑھکتا ہوا دامن میں کھڑے اس کیبھائی کی طرف بڑھ رہا ہے۔ اوپر والے شخص کی شدید خواہش ہے اور وہ دعائیں مانگ رہا ہے کہ یہ پتھر یہیں رک جائے اور

Sanjh Lokraj

اس کے بھائی کو نقصان نہ پہنچائے۔ مگر پتھر کو دامن کی طرف دوڑانے والی مادی قوتیں اندھی بہری اور احساسات سے عاری ہیں کہ وہ اپنا کام پورا کر کے چھوڑتی ہیں۔

اگر آپ ذرا گہرائی میں غور کریں تو مظاہر فطرت اور سماجی تبدیلیوں کے بارے میں ہمارا انحصار غلط پہچانی گئی وجوہات پر ہے اور ہمارے کلچر کی ساری عمارت قیاسات پر کھڑی ہے۔

قیاس پر مبنی غلط پہچانی گئی وجوہات کا کیا نتیجہ نکل سکتا ہے؟

اگر آپ سے کوئی یہ کہے کہ آپ کے صحن میں لگے ہوئے آم کے درخت پر پھل اس لیے نہیں لگتا کہ آپ کی ایک مونچھ چھوٹی اور دوسری بڑی ہے تو آپ یقیناً اس پر ہنس دیں گے۔ لیکن آپ فرض کر لیں کہ آپ نے اس قیاس پر یقین کر لیا اور اتنا پکا یقین کر لیا کہ یہ عقیدے کے درجے تک پختہ ہو گیا۔ تو یہ آپ کی زندگی پر کس طرح اثر انداز ہو گا؟ آپ ساری زندگی اپنی مونچھیں برابر کرتے رہیں گے۔ پھل پھر بھی نہیں لگے گا۔ مگر آپ اپنے پختہ یقین کی وجہ سے آخر تک یہی سمجھتے رہیں گے کہ ہمیشہ مونچھوں ہی میں کوئی نہ کوئی فرق رہ جاتا ہے۔ اپنے قیاس پر نظر ثانی کو کبھی تیار نہیں ہوں گے۔ اس کے برعکس اگر مادی وجوہات دریافت ہو جائیں تو مطلوبہ نتیجہ پیدا کیا جا سکتا ہے۔ سماجی علوم کے تجزیہ نگاروں کی دریافتوں کے مطابق کسی معاشرے کا عروج و زوال، حرکت و جمود، خوشحالی و بدحالی، ترقی اور پسماندگی کی مادی وجوہات ہوتی ہیں۔ بالکل اسی طرح جس طرح مظاہر فطرت مادی وجوہات کی وجہ سے رونما ہوتے ہیں۔ چونکہ کالونیل ازم ہماری پسماندگی کی مادی وجہ ہے، اس لیے کالونیل ازم کا مطالعہ ہم تجربی حقیقت پسندی کے نقطۂ نظر سے کریں گے۔ آج پاکستان کے 99 فیصد سے بھی زیادہ محنت کش لوگ کالونیل سسٹم کی تباہ کاریوں کا شکار ہیں۔ وہ لوگ جن کی فکری وفاداری محنت کش طبقے سے ہے ان کے لیے کالونیل سسٹم کو تاریخی مراحل میں سمجھنے اور اس سے نجات حاصل کرنے کا شعور بیدار کرنے کی یہ کتابچہ ایک کوشش ہے۔

Sanjh Lok Raj

پسماندگی کا ذہنی رویہ

آج آپ کو زندگی کے ہر شعبے میں جتنی انسانی ترقی نظر آ رہی ہے اس کا آغاز فطری و سماجی مظاہر کی مادی وجوہات دریافت کرنے سے ہوا۔ مگر انسانی شعور کو یہاں تک پہنچنے کے لیے ایک لمبا سفر طے کرنا پڑا۔ شعور کے اس سفر کو ہم اپنی آسانی کے لیے چار مراحل میں تقسیم کر کے سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔

پہلا مرحلہ:

انسانی شعور نے جب آنکھ کھولی تو اس کے اردگرد بے شمار کائناتی مظاہر موجود تھے۔ جس کے بارے میں انسان کے ذہن میں کئی سوالات ابھرتے تھے کہ یہ کائنات کیا ہے۔ یہ کیسے وجود میں آئی، سورج کیسے نکلتا ہے، بجلی کیوں چمکتی ہے، زلزلے کیسے آتے ہیں، دریا کیا ہیں، پہاڑوں کے دوسری طرف کیا ہے؟ وغیرہ۔

زراعت کے ابتدائی دور میں انسان کو فرصت کے لمحات میسر آئے۔ وہ ان سوالوں کے جواب سوچتا اور اپنے تجسس کو کسی نہ کسی طرح مطمئن کرتا۔

اس وقت کے چند دانا لوگوں نے ان مظاہر فطرت کی تشریح دیوی دیوتاؤں کے حوالے سے بنائی گئی کہانیوں کے ذریعے کی۔ ان کہانیوں کو مائتھالوجی کہتے ہیں۔ جس طرح ایک بچہ کسی مشکل سے مشکل بات کو ایک کہانی کے ذریعے آسانی سے سمجھ لیتا ہے اس طرح انسان نے مظاہر فطرت کو دیوی دیوتاؤں کی کہانیوں کے ذریعے سمجھا۔ جس طرح بچوں کو اڑنے والے لکڑی کے گھوڑے اور تین تین ہزار سال کے بادشاہوں پر کوئی اعتراض نہیں ہوتا اسی طرح ان لوگوں نے اس تشریح کو نہ صرف قبول کیا بلکہ آگے بڑھایا، اس ذہنی رویئے کو تہذیب کے بچپن کا ذہنی رویہ کہتے ہیں۔ یہ مائتھالوجی کا دور ہے۔

Sanjh Lok Raj

دوسرا مرحلہ:

ہزاروں سالوں میں انسان نے اپنے تجربے سے بہت کچھ سیکھ لیا تھا۔ پہاڑوں کے پار بھی دیکھ لیا تھا۔ مظاہر فطرت کا اتنا عادی ہو گیا تھا کہ اب ان سے خوفزدہ نہیں رہا تھا، دھاتوں کا استعمال سیکھ گیا تھا، پہیہ ایجاد ہو گیا تھا، جس کی وجہ سے اس کی رفتار تیز ہو گئی تھی۔ اب قبائل اکٹھے ہو کر ایک سلطنت میں تبدیل ہو گئے تھے۔ اب سماج میں ایک سوشل آرڈر پیدا کرنے کی ضرورت تھی۔ یہ فریضہ مذہب نے سرانجام دیا اور اس کے ساتھ ساتھ مظاہر فطرت کی تشریح بھی اِسی سوشل آرڈر کی مطابقت میں کی۔ یہ ذہنی رویہ مذاہب کا دور کہلاتا ہے۔

تیسرا مرحلہ:

ہزاروں پہ ہزاروں سال گزرتے گئے انسانی تجربہ آگے بڑھتا گیا۔ مشاہدے نے انسان کو بہت کچھ سکھا دیا تھا۔ سماج میں ادارے تشکیل پا چکے تھے کچھ علوم نے مذہبی علم سے الگ اپنی حیثیت منوالی تھی۔ اس دور میں کسی بھی چیز کو ثابت کرنے کے لیے دلائل دینا ضروری تھا۔ یہ دور تلاش اسباب کا دور کہلاتا ہے۔ جسے (Age of reason) سے ترجمہ کیا گیا ہے۔ اس دور میں دو متضاد اور ایک دوسرے سے ٹکرانے والے خیالات پیدا ہوئے اور دو مخصوص ذہنی رویوں نے جنم لیا۔ دونوں نے اپنے اپنے طور پر فطری و سماجی مظاہر کی تشریح کی۔

قیاسیت:

اس وقت کے دانا لوگوں کے ایک گروہ کا خیال تھا کہ کائنات باطل ہے، غیر حقیقی ہے، محض ہمارا وہم ہے، دل بہلانے کے لیے وجود میں لائی گئی ہے، کسی بھی وقت ختم ہو سکتی ہے، مادہ کوئی وجود نہیں رکھتا، آپ جو کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں یہ ہماری نظروں کا دھوکہ ہے، مظاہر فطرت میں کوئی اٹل قانون موجود نہیں، یہ کئی بار ٹوٹے، اوّل سے آخر تک دنیا و کائنات کا مکمل علم پہلے ہی سے ایک تجوری میں بند ہے، دنیا کا اکّا دُکّا خاص شخص اپنے مراقبے کے ذریعے اس علم تک پہنچ پاتا ہے، اس طرح حاصل کیا گیا علم ہی دنیا کی آخری و حتمی سچائی ہے، ہر مراقبہ کرنے والی اتھارٹی کا مراقبہ ایک دوسرے الگ ہوتا تھا۔

تجربیت:

اس وقت کے دانا لوگوں میں ایک دوسرے گروہ کا خیال تھا کہ کائنات ایک حقیقی

Sanjh Lok Raj

وجود رکھتی ہے۔ جو کچھ ہماری نظروں کے سامنے ہے یہی حقیقت ہے، مادہ ازل سے موجود ہے اور ابد تک رہے گا، مادہ اپنی شکلیں بدلتا ہے مگر فنا نہیں ہوتا، مادہ ہماری سوچ کے باہر اپنا آزاد وجود رکھتا ہے، یعنی اپنے وجود کے لیے ہماری سوچ کا محتاج نہیں ہے کہ اگر اسے ہم سوچیں تو ہے نہ سوچیں تو نہیں ہے، مظاہر فطرت اٹل مادی قوانین کے تابع رونما ہوتے ہیں، کروڑ ہا کروڑ سال میں بھی آپ ان میں ذرہ بھر تبدیلی نہیں پاتے، چونکہ مادہ ایک بدیہی حقیقت ہے اس لیے اس کا علم ہم حسی مشاہدے سے حاصل کر سکتے ہیں، کائنات کی ہر جاندار اور بے جان شے بذات خود علم کی ایک تجوری ہے، اور حسی مشاہدے اس تک پہنچنے کا واحد ذریعہ، تسخیر کائنات کبھی نہ ختم ہونے والا عمل ہے، اس لیے علم کے لیے کبھی نہیں کہا جا سکتا کہ اب یہ مکمل ہو گیا ہے۔ جوں جوں انسان اپنے حسی تجربہ سے کائنات کے مادی راز کھولتا جائے گا علم آگے بڑھتا رہے گا۔ اس نقطہ نظر کو تجربیت اس لیے کہا گیا ہے کہ یہ مادہ کو حقیقی مان کر اس کے حسی مشاہدے کے ذریعے علم حاصل کرنے پر یقین رکھتا ہے۔

چوتھا مرحلہ:

یہاں تک کے تین ادوار تھے۔ مظاہر فطرتی و سماجی کو کبھی کہانی کیذریعے، کبھی مذاہب کی بیان کردہ تشریح کے ذریعے اور کبھی محض زبانی کلامی دلائل سے ثابت کرنے کے۔ لیکن یہ چوتھا مرحلہ ہے کسی دعوے کو تجربی شہادت سے سچ یا غلط ثابت کرنے کا۔ ہم اسے ایک مثال سے سمجھتے ہیں۔

ہزاروں سال سے انسان کا مشاہدہ رہا ہے کہ لوہے کا ٹکڑا پانی پر نہیں تیرتا اور لکڑی پانی پر تیرتی ہے۔ جب لکڑی کے پانی پر تیرنے کی مادی وجوہات دریافت کر لی گئیں تو اب تیسرے مرحلے کے تجربیت کے دعوے داروں کا امتحان تھا کہ کیا واقعی انسانی حواس مادے کا علم حاصل کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں؟

جب لکڑی کے تیرنے کی خصوصیات کو لوہے میں بھر کر تیرایا گیا تو دنیا نے دیکھا کہ ہزاروں ٹن لوہا بحری جہازوں کی شکل میں دنیا کے سمندروں میں تیر رہا ہے۔ اس طرح تجربیت کا دعویٰ سچ ثابت ہوا اور تہذیب انسانی شعور کے ارتقاء کے چوتھے مرحلے یعنی سائنس کے دور میں داخل ہو گئی۔ پھر تجربیت کے اصولوں کو سماج پر لاگو کیا گیا تو سماجی علوم اب سماجی سائنس

Sanjh Lok Raj

میں تبدیل ہو گئے۔

ہم اپنے ذہنی رویئے کے لحاظ سے انسانی شعور کے ارتقاء کے کس مرحلے پر کھڑے ہیں؟ اس کا فیصلہ آپ کو خود کرنا ہے۔ مگر ہمارے معاشرتی جمود نے جس طرح حقیقت تک پہنچنے کے ہمارے راستوں کو بند کیا ہے اس کا تجزیہ ضروری ہے۔

1۔ اپنے قیاس کو حتمی سچائی سمجھنا یہاں تک کہ اسے عقیدے کے درجے تک پختہ کر لینا۔

2۔ اپنے قیاس کی تائید میں ملنے والے خیالات کو علم اور اپنے قیاس سے ٹکرانے والے خیالات کو جہالت سمجھنا۔

3۔ اپنے قیاس کے تبدیل ہو جانے کے تصور سے خوفزدہ رہنا۔

4۔ اپنی آنکھوں پر یقین کرنے کی بجائے اتھارٹی پر یقین کرنا۔ مثال کے طور پر ارسطو نے لکھا تھا کہ عورت کے دانتوں کی تعداد مرد سے کم ہوتی ہے۔ دو ہزار سال تک جب تک ارسطو کی اتھارٹی علم پر مانی جاتی رہی تب تک لوگوں کا ایمان تھا کہ عورت کے دانت واقعی تعداد میں مرد کے دانتوں سے کم ہوتے ہیں۔ کیونکہ ارسطو سے بڑا کوئی عالم پیدا ہو تو ارسطو کی بات کو چیلنج کرے۔ لیکن جب مفروضے کی سچائی کو شہادت فراہم کرنے کا زمانہ آیا تو ناقدین نے لکھا کہ ارسطو کی دو بیویاں تھیں اگر وہ ان کے منہ میں انگلی ڈال کر ان کے دانت گن لیتا تو اتنی بڑی غلطی نہ کرتا۔

اگر کسی دوائی کی پہلی خوراک سے مرض میں افاقہ ہو تو سمجھا جاتا ہے کہ اس دوائی کا مسلسل استعمال مرض کو ختم کرنے میں مددگار ثابت ہوگا۔ اس کے برعکس اگر ایک دوائی مسلسل استعمال کی جاتی رہے اور کوئی افاقہ نہ ہو اور ہم دوائی بھی تبدیل نہ کرنا چاہیں تو اس سے یہی مطلب نکالا جائے گا کہ ہم میں زندہ رہنے کی خواہش ختم ہو گئی ہے۔

Sanjh Lok Raj

کالونیل ازم یا سامراج

اب تو یہ باتیں اخبارات کی سرخیوں میں پڑھنا اور ٹی وی پر سننا ہمارا معمول بن گیا ہے کہ

1۔ پاکستان غیر ملکی سرمایہ کاری کے لیے ایک آئیڈیل جگہ ہے۔
2۔ عالمی بنک کی طرف سے پاکستان کے لیے نئے قرضوں کی منظوری۔
3۔ برآمدات میں اضافے کے لیے روپے کی قیمت میں مزید کمی۔
4۔ پاکستان کا تجارتی خسارہ تین سال میں دگنا ہو گیا۔
5۔ فارن کرنسی ذخائر میں کمی سابقہ حکومت کی غلط پالیسیوں کا نتیجہ ہے۔
6۔ قرضوں کے سود کی قسط کی ادائیگی کے لیے قومی اثاثوں کی فروخت۔
7۔ منافع بخش معاشی یونٹوں کی نجکاری سے بیروزگاری میں اضافہ۔
8۔ آزادی کے 62 ویں سال قومی اسمبلی میں خسارے کا باسٹھواں بجٹ پیش۔
9۔ آئی ایم ایف نے بجلی اور گیس کے نرخوں میں اضافے کی شرط عائد کر دی۔
10۔ ملٹی نیشنل کمپنیوں کو سرکاری اراضی کی فروخت کی اجازت۔
11۔ افراط زر میں اضافہ کے باعث مہنگائی میں اضافہ۔
12۔ پاکستان کے 45 فیصد لوگ خط غربت سے نیچے زندگی گزارنے پر مجبور۔
13۔ فوج اور پولیس کے علاوہ تمام بھرتیاں کنٹریکٹ پر ہوں گی۔

Sanjh Lok Raj

یہ سب ایک ہی بیماری کی علامات ہیں۔ یعنی یہ کالونیل ازم ہی کے مختلف اظہار ہیں۔ لیکن اس کا ذکر چونکہ ہماری نصاب کی کتابوں میں کہیں موجود نہیں اس لیے اس کو ابتدا سے آخر تک سمجھنے کے لیے ہمیں اسے مختلف مراحل میں تقسیم کرنا ہوگا۔

کالونیل ازم کا لفظی مطلب ہے نئی بستی بسانا۔ کسی اور جگہ آبادی کرنا۔ جیسے یورپیوں نے امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ میں کیا۔ مگر ہندوستان اور دوسری کیجگہوں پر تو یہ لوگ دولت سمیٹنے آئے تھے۔ تو پھر یہاں کالونیل ازم کا لفظ کیوں استعمال کیا گیا؟ دراصل یہاں انہوں نے اپنے عزائم کو دنیا کی نظر سے اوجھل رکھنے کے لیے کالونیل ازم کا لفظ استعمال کیا۔ ہم ان کے استعمال کئے ہوئے لفظ ہی کو استعمال کرنے پر اس لیے مجبور ہیں کہ اب یہ لفظ ایک اصطلاح کے طور پر پوری دنیا میں مستعمل ہو چکا ہے۔

ہندوستان کے لیے ہم کالونیل ازم کی جگہ سامراج کا لفظ استعمال کرتے ہیں جس کا مطلب ہے غیروں کا راج۔ مگر یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ غیروں کا راج تو ہندوستان پر ہزاروں سال رہا ہے۔ تو پھر انگریزوں کے راج اور اس سے پہلے کے بیرونی حملہ آوروں کے راج میں کیا فرق ہے؟

انگریزوں سے قبل کے تمام غیر ملکی حملہ آور جنہوں نے ہندوستان پر حکومت کی انہوں نے خود کو صرف ٹیکس اکٹھا کرنے تک محدود رکھا اور ہندوستان کے قدیمی معاشرتی ڈھانچے کو نہیں چھیڑا۔ اسے جوں کا توں برقرار رکھا۔ مگر انگریزوں نے دو سو سالہ قبضہ کے دوران ہندوستان کے قدیمی معاشرتی و معاشی ڈھانچے کو توڑ کر اپنے مفادات کے تابع از سر نو تشکیل دیا۔ جس کے نتیجے میں آج بھی یورپی ممالک ہماری 99 فیصد سے بھی زیادہ آبادی کی محنت کی کمائی آسانی سے اپنے ملک میں لے جاتے ہیں۔

سامراجیت کہاں سے شروع ہوئی ہے؟ کالونیل ازم کا بنیادی نقطہ کیا ہے؟

سب سے پہلے تو یہ بات یاد رکھنے والی ہے کہ سامراجیت کا آغاز دنیا کے چند ممالک کا صنعتی ترقی کر جانے سے ہوا۔ صنعتی ترقی سے قبل بھی اگرچہ یورپی ممالک کا دنیا کے بہت بڑے حصے پر قبضہ تھا مگر اس وقت کالونیل ازم کی شکل اور تھی۔

فرض کریں کہ ایک صنعتی ملک اپنے کارخانوں کی ساری کی ساری پیداوار کی کھپت

Sanjh Lokraj

اپنے ہی ملک میں کرتا ہے۔لیکن ایسا فرض کرنا ممکن نہیں کیونکہ سرمایہ دار مما لک میں پیداوار منافع کمانے کی غرض سے کی جاتی ہے۔ اور صنعت کار اپنی پیداوار کی قیمت بھی خود مقرر کرتا ہے۔ اس وجہ سے بہت سی پیداوار جو لوگوں کی قوت خرید سے زیادہ ہوتی ہے بچ جاتی ہے۔ یہ فاضل پیداوار کہلاتی ہے۔

اب فاضل پیداوار کی کھپت تک مزید پیداوار روکی تو نہیں جا سکتی اور نہ ہی اس فاضل پیداوار کو سمندر میں پھینک کر ختم کیا جا سکتا ہے۔ اس فاضل پیداوار کی کھپت کے لیے بیرون ملک منڈیاں تلاش کی جاتی ہیں۔ اسے تجارت کا نام دیا جاتا ہے۔ اگر دو برابر کے صنعتی مما لک آپس میں اپنی اپنی ملکی فاضل پیداوار کا اس طرح تبادلہ کریں کہ ایک ایک سوملین کی چیزیں ایک دوسرے کو دیں تو یہ ان ملکوں کے درمیان تجارتی توازن کہلائے گا۔ اگر ایک ملک دوسرے کو 100 ملین کا مال بیچے اور دوسرے ملک سے 50 ملین کا مال خریدے تو اس طرح دوسرے ملک کو پچاس ملین کا تجارتی خسارہ ہوگا۔

اگر کوئی صنعتی ملک اپنی فاضل پیداوار کسی زرعی ملک کو فروخت کرے اور زرعی ملک کے پاس صنعتی ملک کو بیچنے کے لیے خام مال کے سوا کچھ نہ ہو تو زرعی ملک ہمیشہ ہر سال خسارے میں رہے گا۔ اور خسارہ پورا کرنے کے لیے قرضہ لیتا رہے گا۔ قرض کے ساتھ شرائط بھی ہوں گی کہ یہ کہاں کہاں استعمال کرنا ہے اور کہاں استعمال نہیں کرنا۔ اور قرض دینے والا ملک یہ بھی طے کرے کہ زرعی ملک کا سیاسی و معاشی ڈھانچہ کیسا ہو یعنیا گر کوئی صنعتی ملک کسی زرعی ملک کو اپنی مصنوعات کی کھپت کے لیے مستقل منڈی رکھنے کے لیے پسماندہ رکھے تو سامراجیت یہاں سے شروع ہوتی ہے۔ اب تک سامراجیت کی دو شکلیں ہمارے سامنے ہیں۔

1۔ کسی پسماندہ ملک پر فوجی طاقت استعمال کر کے اس پر قبضہ رکھ کر اس کے سیاسی معاشی ڈھانچے کو اپنے کنٹرول میں رکھنا، یہ سامراج ہے۔

2۔ کسی پسماندہ ملک پر قبضہ رکھے بغیر ہی اس کے سیاسی معاشی ڈھانچے کو اپنے کنٹرول میں رکھنا۔ یہ جدید سامراج ہے۔

زرعی معیشت پر جامد کر دیئے گئے مما لک ہمیشہ صنعتی ملکوں کے مال کیمنڈی ہوتے

Sanjh Lok Raj

ہیں جس کی وجہ سے سرمائے کا نکاس زرعی ملک سے صنعتی ملک کو ہوتا ہے اس طرح زرعی ملک ہمیشہ مقروض اور صنعتی ملک خوشحال رہتا ہے۔ زرعی ملک میں زرعی پیداوار کی جو رفتار ہوتی ہے وہی رفتار اس کی ذہنی پیداوار کی بھی ہوتی ہے اور صنعتی ممالک میں مادی پیداوار کی جو رفتار ہوتی ہے وہی رفتار اس کی ذہنی پیداوار کی بھی ہوتی ہے۔ اس لیے زرعی ممالک اپنے سست پیداواری عمل کے باعث ترقی کی دوڑ میں پیچھے رہتے ہیں۔ برطانوی سامراج نے ہماری معیشت کو زراعت پر جامد کر کے اس کی حفاظت کے لیے بیوروکریٹک سیاسی ڈھانچہ تشکیل دیا جو آزادی کے نام پر برطانوی قبضے سے سیدھا امریکی قبضے میں چلا گیا۔ لیکن براہ راست کیا جانے والا کالونیل راج خود بخود بغیر کسی اداراتی ترمیم کے بالواسطہ کیے جانے والے جدید کالونیل راج میں تبدیل نہیں ہو جاتا۔ اس کو سمجھنا ہی اس کتابچہ کی غرض و غایت ہے۔

لہٰذا کالونیل ازم، سامراج اور نوآبادیاتی نظام کے الفاظ ایک ہی معانی میں استعمال ہوئے ہیں۔ اور نیو کالونیل ازم جدید سامراج اور جدید نوآبادیاتی نظام دوسری جنگ عظیم کے بعد ابھرنے والے امریکی سامراجی سسٹم کے لیے استعمال ہوئے ہیں۔

Sanjh Lok Raj

تجارتی سرمایہ کا دور(1600-1815)

17 ویں صدیں میں ہندوستان اور یورپ معاشی، سیاسی اور سماجی لحاظ سے ایک جیسے تھے۔ دونوں خطوں میں زرعیمعیشت تھی، بادشاہی کا سیاسی نظام تھا، گھریلو دستکاری تھی، مگر دونوں میں جاگیرداری کا نظام کمزور ہو رہا تھا اور تاجر طبقہ تیزی سے ترقی کر رہا تھا۔ جس کی سرپرستی حکومتیں کر رہی تھیں۔ تجارتی سرمایہ داری دونوں جگہ فروغ پا رہی تھی۔ اس دور کو تجارتی سرمایہ داری اس لیے کہا گیا ہے کہ اس وقت تک مشین ایجاد نہیں ہوئی تھی۔ دونوں جگہ اس یکسانیت کے باوجود ایک گہرا فرق بھی تھا۔ ہندوستان ایک وسیع ملک تھا جس کی وجہ سے اس کا ساحلی علاقہ دور تھا۔ اس لیے یہاں کی حکومتوں نے بحری طاقت پر توجہ نہیں دی اور سمندروں میں اس کا اثر و رسوخ نہیں بڑھ سکا۔ یہ وجہ تھی کہ ہندوستانی تاجر سمندر پار ملکوں میں تجارت کو زیادہ فروغ نہیں دے سکے اور ان کا دائرہ کار اندرون ملک کی منڈیوں تک محدود رہا۔

اس کے مقابلے میں برطانیہ ایک چھوٹا سا ملک تھا۔ سمندر اس کے قریب تھا اس لیے تجارت کے لیے انہیں سمندری راستوں کو تلاش کرنے کی ضرورت تھی اس نے انہیں اس بات پر مجبور کیا کہ وہ اپنی بحری طاقت کو بڑھائیں۔

1600ء میں لندن میں 70,000 پاؤنڈ کے ابتدائی سرمایہ کی مدد سے ایسٹ انڈیا کمپنی قائم کیگئی تا کہ ہندوستان سے اجناس، ریشمیو سوتی کپڑا، چینی کے برتن اور گرم مسالہ کا کاروبار شروع کر دے۔

1608ء میں کیپٹن ہاکنز ہندوستان آیا اور سورت میں ایک تجارتی اڈا قائم کیا۔

1615ء میں سر ٹامس رو نے جہانگیر بادشاہ سے مزید تجارتی مراعات حاصل کیں جس سے انگریزی تجارت کو اور بھی فروغ ملا۔

Sanjh Lok Raj

ہندوستان کا تاجر طبقہ یورپی تاجروں کی طرح جاگیرداری کو کمزور نہیں کر سکا اور اپنی علیحدہ حیثیت سے وہ طاقتور بن کر ابھر نہیں سکا۔ اس لیے جب یورپی اقوام ہندوستان میں آئیں تو یہاں کے تاجر طبقہ نے انہیں خوش آمدید کہا۔ کیونکہ ان کے آنے سے انہیں دو فائدے ہوئے۔

1۔ ان کے جہازوں کے ذریعے انہوں نے اپنا مال غیر ملکوں میں بھیجنا شروع کر دیا۔

2۔ انہوں نے ان کے اور ہندوستانی کاریگروں کے درمیان دلال کا کام کیا۔ یہ طفیلی بن گئے۔

برطانیہ سے ہندوستان کی طرف تجارتی سرمائے کا بہاؤ:

ہندوستانی معاشرہ خود کفیل دیہاتوں پر مشتمل تھا۔ اکثر ہر گاؤں اپنی ضرورت کی مصنوعات خود بناتا تھا۔ ہندوستان کے طول وعرض میں کپڑے کی صنعت، فولاد کی بھٹیاں، شیشے کا سامان، سلک ساٹن زربفت، قالین، عطریات، سامان تعیش، اور دیگر دستکاریاں مختلف حصوں میں پائی جاتی تھیں۔ یہ بات اہم ہے کہ اس زمانے کا ہندوستان اپنے خام مال کو استعمال کر کے اپنی ضرورت کی مصنوعات خود بناتا تھا۔ وہ نہ بیرونی مصنوعات کا محتاج تھا نہ اس کو اپنا خام مال برآمد کرنے کی ضرورت تھی۔ ان کے پاس برآمد کرنے کے لیے تو کئی مصنوعات تھیں مگر درآمد کرنے کے لیے کسی چیز کی ضرورت نہیں تھی۔

یورپی عوام شکایت کرتے تھے کہ ان کے بالائی طبقے برصغیر کا بنا ہوا سامان تعیش استعمال کرتے ہیں اور اس بنا پر ان کی دولت ہندوستان چلی جاتی ہے۔

ایسی صورتحال میں انگریز تاجر کو ہندوستانی مال کے عوض سونا چاندی دینا پڑتا تھا جس سے سرمائے کا بہاؤ ہندوستان کی طرف تھا۔ انگریزوں نے وسطی امریکہ میں غلاموں کی تجارت سے جو روپیہ کمایا تھا وہ ہندوستان منتقل ہو رہا تھا۔ ہندوستان اس تجارت سے امیر ہو رہا تھا مگر اس کی اندرونی لڑائیاں اسے کمزور کر رہی تھیں جس کا فائدہ اٹھاتے ہوئے انگریزوں نے اس کے سیاسی اقتدار پر قبضہ کر لیا۔

1757ء پلاسی کی جنگ میں ہندوستانی تاجر طبقہ نے انگریزوں کا ساتھ دیا جس

Sanjh Lokraj

کے نتیجے میں بنگال، بہاراوراڑیسہ انگریزوں کے قبضے میں چلا گیا۔

1765ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی کوان تینوں صوبوں کی دیوانی مل گئی جس میں ٹیکس کی وصولی اور خزانہ کے انتظام کا حق شامل تھا۔ اب تک کمپنی کی تجارت سے جو سرمایہ ہندوستان آرہا تھاوہ ختم ہوگیا، بلکہ اب سرمائے کا بہاؤ ہندوستان سے برطانیہ کو ہونے لگا۔

ہندوستان سے برطانیہ کوسرمائے کا بہاؤ:

1765ء میں برطانیہ کے ہندوستان پر راج کا آغاز ہوا تھا جو بظاہر ہندوستانی حکمران کے تحت ہی رہا مگراب ہندوستان سے لوٹی ہوئی دولت برطانیہ جانا شروع ہوگئی۔

1766ء میں رابرٹ کلائیو نے کمپنی کے ڈائریکٹروں کولندن میں لکھا۔

''بنگال کے نواب کا معاوضہ پہلے ہی گھٹا کر 42 لاکھ کر دیا گیا ہے۔اور مغل بادشاہ کو دیا جانے والا نذرانہ 26 لاکھ مقرر ہوا ہے۔ اس طرح کمپنی کو ایک کروڑ بائیس لاکھ سکہ روپے یعنی 16 لاکھ 50 ہزار 9 سو پاؤنڈ کا فائدہ ہوا ہے۔

1770ء میں مرشد آباد کا انگریز ریذیڈنٹ بیچر لکھتا ہے کہ

''جب سے کمپنی کے پاس دیوانی آئی ہےعوام کی حالات بد سے بدتر ہوگئی ہے۔ یہ ملک انتہائی جابرسلاطین کے زمانے میں بھی خوش حال تھا۔لیکن اب جب سے اس کے نظم ونسق کی ذمہ داری انگریزوں پر عائد ہوئی ہے یہ مکمل تباہی و بربادی کی طرف جارہا ہے۔''

1771ء میں برطانوی پارلیمنٹ میں کمپنی کی جو رپورٹ پیش ہوئی اس میں بتایا گیا کہ اس عرصہ میں کمپنی کی آمدنی1,30,66,761 پاؤنڈ اخراجات90,27,607 پاؤنڈ ہوئے اور بقایا40,37,152 پاؤنڈ برطانیہ ارسال کیے گئے۔

جب میر جعفر کو جنگ پلاسی کے بعد پہلی دفعہ نواب بنایا گیا تو برطانوی افسران اور فوجیوں نے1,238,575 پاؤنڈ کی خطیر رقم بونس کے طور پر وصول کی۔ جب1760ء میں میر قاسم کونواب بنایا گیا تو انگریزوں نے2,00,296 پاؤنڈ نذرانے کے طور پر وصول کیے۔1763ء میں جعفر کو دوسری مرتبہ نواب کے عہدے پر فائز کیا گیا تو اس مرتبہ 500,165 پاؤنڈ نذرانے کے طور پرہتھیا لیے۔1765ء میں نجم الدولہ کونواب بنایا گیا تو حسب سابق230,356 پاؤنڈ کی بھاری رقم وصول کی گئی پھراس کی حکومت ختم کرنے کا ڈرا

Sanjh Lok Raj

کر37,70,883 پاؤنڈ بطور تاوان وصول کیے گئے۔ یہ اعداد وشمار برطانوی پارلیمنٹ کمیٹی آف ہاؤس آف کامنز کی1773 کی رپورٹ سے لیے گئے ہیں۔

1783ء میں ایڈمنڈ برک نے جو انگلینڈ کی پارلمینٹ کا بہت بڑا مقرر تھا نے ایک مشہور زمانہ تقریر کی۔ کہا تاریخ عالم میں ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت سے زیادہ رشوت خور اور تباہی خیز آمریت کی مثال نہیں ملتی۔ کوئی بادشاہ نواب یا نواب زادہ بڑا یا چھوٹا ایسا نہیں ہے جو ہم سے ہندوستان میں ملا ہو اور ہم نے اسے بیچ نہ دیا ہو۔ ہم نے کوئی ایسا معاہدہ نہیں کیا جو توڑا نہ ہو اور کوئی نوابی یا ریاست ایسی نہیں ہے کہ جس نے ہم پر اعتبار کیا ہو اور ہم نے اسے برباد نہ کیا ہو۔

ڈگبی (Digby) کے اندازے کے مطابق 1757ء اسے 1813ء تک انگریزوں نے ہندوستان سے ایک ارب پاؤنڈ خزانہ سمیٹا اور برطانیہ منتقل کر دیا۔

برطانیہ میں صنعتی انقلاب:

ادھر ہندوستان میں ایسٹ انڈیا کمپنی کا راج عروج پر پہنچ چکا تھا دوسری طرف برطانہ میں ایجادات ہو رہی تھیں بقول بروکس ایڈم ایجادات بذات خود کچھ نہیں ہوتیں جب تک کہ انہیں استعمال نہ کیا جائے اور انہیں اس وقت استعمال کیا جا سکتا ہے جب اس کے لیے ذرائع ہوں۔ ورنہ ایجادات صدیوں بے کار پڑی رہتی ہیں۔ ہندوستان سے لوٹی ہوئی دولت نے انگلستان کی ایجادات کے استعمال کے ذرائع فراہم کیے جس کی وجہ سے برطانہ میں صنعتی انقلاب آیا۔ انگلستان میں سب سے پہلی صنعت کپڑے کی صنعت تھی1815ء تک ہندوستان میں کالونیل ازم کا پہلا مرحلہ مکمل ہوا۔ ادھر برطانیہ میں صنعتی انقلاب مکمل ہوا۔

کالونیل ازم کے اس پہلے مرحلے میں مقبوضہ علاقوں میں کسی قسم کی کوئی تبدیلی نہیں کی گئی نہ انتظام امور میں نہ عدالتی نظام میں، نقل وحمل، کمیونیکیشن، زرعی وصنعتی پیداوار کے طریقے، کاروباری معاملات کے اصول وضوابط، معاشی انتظام وانصرام حتیٰ کہ نظام تعلیم، کلچر، سماجی تنظیم، غرض کہ ہر لحاظ سے پرانے نظام کو برقرار رکھا گیا۔ البتہ پہلے مرحلے میں جن شعبوں میں تبدیلیاں لائی گئیں وہ فوجی تنظیم وٹیکنالوجی تھے۔ اس طرح ٹیکس وصول کرنے کے نظام کو اور بھی موثر بنا دیا گیا۔ اسی مرحلے میں سامراجیوں نے مقامی زبانوں، مذاہب، معاشرت اور قانون کو سمجھنے کی کوشش کی۔

Sanjh Lok Raj

صنعتی سرمایہ کا دور(1815-1900)

برطانیہ میں نوآبادیوں سے لوٹی ہوئی دولت نے صنعتی انقلاب برپا کیا۔صنعت نے معاشرے میں دو نئے طبقوں کو جنم دیا۔ سرمایہ دار اور مزدور۔ صنعتی سرمایہ داروں کے نئے ابھرے طبقے کے مفادات ایسٹ انڈیا کمپنی کے تجارتی سرمایہ داروں سے مختلف تھے۔ ان کی ترجیحات یہ تھیں۔

1۔ اپنی مقامی منڈی کو بیرونی درآمدات سے محفوظ کیا جائے تاکہ قومی صنعت ترقی کرے۔

2۔ اپنی مصنوعات کی فروخت کے لیے بیرونی منڈیوں پر قبضہ کیا جائے۔

3۔ اپنی صنعتوں کے لیے بیرونی ممالک سے سستا خام مال حاصل کیا جائے۔

برطانیہ کا صنعتی سرمایہ دار طبقہ جو اس وقت تک اپنے ملک کی سیاست پر چھا چکا تھا۔ وہ برطانوی پارلیمنٹ میں منتخب ہو کر اقتدار میں آنے لگا تھا۔ اس نے اپنے معاشی مفادات کے تحفظ کے لیے قانون سازی کا عمل شروع کیا۔

1817ء میں ایک چارٹر کے ذریعے کمپنی کی اجارہ داری ہندوستانی تجارت سے ختم کر دی گئی اب کوئی بھی برطانوی تجارتی کمپنی ہندوستان میں تجارت کر سکتی تھی۔

H.H. Wilso لکھتا ہے۔

''1813ء میں ہندوستانی ریشمی کپڑا، سوتی و اونی مصنوعات منافع کماتے ہوئے بھی برطانوی منڈی میں برطانیہ کے تیار شدہ کپڑے سے نصف قیمت پر فروخت کیا جا سکا تھا۔لہٰذا لازمی ہو گیا کہ ہندوستانی کپڑے پر 80 فیصد ڈیوٹی لگائی جائے اور اسے برطانوی

Sanjh Lok Raj

کپڑے سے مہنگا کر دیا جائے۔ اگر ایسی ڈیوڈیاں نہ لگائی جاتیں تو برطانیہ کے کپڑے کی ملیں اپنی ابتداء ہی میں بند ہو جاتیں اور شاید بھاپ کی قوت کے باوجود بھی دوبارہ حرکت میں نہ آتیں۔ انہیں ہندوستان کی مصنوعات کو قربان کر کے وجود میں لایا گیا''

اس کے بعد یہ ہوا کہ ہندوستان اب تک جو دنیا کو کپڑا فراہم کرتا تھا اس کی صنعت تباہ کر دی گئی اور اب اس کی منڈیوں میں برطانیہ کا کپڑا فروخت ہونے لگا۔ مزید یہ کہ برطانیہ میں ہندوستانی کپڑا استعمال کرنے والے برطانوی شہریوں پر 5 پاونڈ کا جرمانہ عائد کر دیا گیا۔ تاکہ برطانوی اپنے ہی ملک کا کپڑا استعمال کرنے پر مجبور ہوں۔ معاشیات کا اصول یہ ہے کہ جو ملک صنعتی ترقی کے ابتدائی مراحل میں ہوگا وہ اپنی قومی صنعتوں کو بچانے کے لیے غیر ملکی مصنوعات کی درآمد پر پابندی لگائے گا یا غیر ملکی مصنوعات پر اتنے بھاری ٹیکس عائد کرے گا کہ وہ مصنوعات اسکی ملکی مصنوعات سے مہنگی ہو جائیں۔ ایسے ٹیکس کو ٹیرف کہتے ہیں۔

مثال کے طور پر اگر آج ہم پاکستان میں تالا بنانے کے کارخانے لگانے کا آغاز کریں مگر چین کا تالا پاکستانی تالے سے سستا ملتا رہے تو ہماری تالے کی صنعت ابتداء ہی میں دم توڑ جائیگی اس لئے حکومت کو غیر ملکی تالے کی درآمد پر پابندی لگانی پڑے گی یا اس پر اتنا ٹیکس لگایا جائیگا کہ وہ ہر حال میں پاکستانی تالے سے مہنگا رہے ہندوستانی سوتی اور ریشمی کپڑے پر برطانوی منڈی میں ٹیکس کا یہ اثر ہوا کہ 1850 تک برطانیہ کے کپڑے کی کل برآمد کا ایک چوتھائی ہندوستان کی منڈی میں بکنے لگا۔ اس وجہ سے ہندوستان میں ہزاروں جولاہے بے روزگار ہو گئے۔

روزمرہ کے ٹیکسوں کی بھرمار، بیروزگاری، غربت و افلاس ہندوستانیوں کا جینا محال کرتے جا رہے تھے۔ ادھر برطانیہ کا ہندوستان کے تمام علاقے پر قبضہ مکمل ہو گیا۔

1854 میں برطانوی پارلیمنٹ کے ایک ممبر بلیکٹ نے تقریر کرتے ہوئے کہا کہ غریب عوام کمر توڑ وصولیوں کی وجہ سے پس کر مٹی میں مل گئے ہیں۔ یہ وصولیاں تیسرے درجے کی ایذا رسانی سے کی جاتی ہیں اور اس طرح انتہائی ظلم کیا جاتا ہے۔

1857 کی جنگ آزادی میں بہادر شاہ ظفر نے جو منشور پیش کیا اس میں انگریزوں پر چار بڑے الزامات لگائے گئے۔ جن سے اس وقت کے معاشی حالات کو سمجھنے میں

Sanjh Lok Raj

مدد ملتی ہے۔

1- زمینداروں کا مالیہ بڑھایا جارہا ہے۔ چونکہ وہ اتنا زیادہ مالیہ نہیں دے سکتے اس لیے اُن کی جائیدادیں نیلام کی جارہی ہیں اور انہیں بڑی مہنگی مقدمہ بازی میں ملوث کیا جارہا ہے۔

2- کافر اور دھوکے باز حکومت نے ساری منافع بخش تجارت مقامی تاجروں سے چھین کر اپنی اجارہ داری میں لے لی ہے اور مقامی تاجروں پر ٹیکس کی بھرمار ہوگئی ہے۔

3- انگریزی حکومت میں بڑے اور زیادہ تنخواہ کے عہدے انگریزوں کے لیے وقف ہیں اور دیسی لوگوں کے لیے ان کی ملازمت میں نہ عزت ہے نہ تنخواہ۔

4- انگریزی ساخت کے مال کی درآمد نے ہندوستان کی کپڑے، لکڑی، لوہے اور چمڑے کی صنعتوں کو زبردست نقصان پہنچایا ہے اور کاریگر بھیک مانگنے پر مجبور ہوگئے ہیں۔

اس برطانوی پالیسی کا نتیجہ یہ ہے کہ 1857 میں 50 لاکھ ہندوستانی فاقے سے مرگئے۔ اب برطانوی مصنوعات کو ہندوستان کے دور دراز علاقوں تک پہنچانے اور دوردراز علاقوں سے خام مال یعنی کپاس ساحل سمندر تک لانے کے لئے ریلوے لائن بچھائی گئی۔ جس کے ذریعے کپاس برطانیہ جانے لگی اور کپڑا ہندوستان آنے لگا۔ 1844 میں 8 کروڑ 80 لاکھ پاؤنڈ کپاس برطانیہ بھیجی گئی جو بڑھ کر 1914 میں 96 کروڑ 30 لاکھ پاؤنڈ ہوگئی۔ اس کام کے لیے ریلوے سٹیشنوں کے ساتھ غلہ منڈیاں بنائی گئیں اور قیمتیں کنٹرول کرنے کے لیے مارکیٹ کمیٹیاں تشکیل دیں اور اس سے قبل کالونیل دور کے پہلے مرحلے میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے تجارتی سرمایہ داروں نے ہندوستان کے معاشرتی ڈھانچے میں کوئی تبدیلی نہ کی۔ مگر کالونیل دور کے دوسرے مرحلے میں جب برطانیہ میں صنعتی سرمایہ دار طبقہ برسراقتدار آیا اس نے 1857 میں ہندوستان سے کمپنی کی حکومت کا خاتمہ کر دیا اور ہندوستان کو براہ راست برطانوی حکومت کی غلامی میں دے دیا۔ اس مرحلے میں ہندوستان کو برطانیہ کے صنعت کار طبقہ کے معاشی مفادات کے مستقل بنیادوں پر تابع رکھنے کے لیے جو معاشی ڈھانچہ تشکیل دیا گیا۔ اور اس کالونیل معاشی ڈھانچے کی حفاظت کے لیے جو سیاسی نظام رائج کیا گیا اس کا محور ہندوستان کی معیشت کو زراعت پر جامد کر دینا تھا۔ تاکہ یہ غیر ملکی مصنوعات کی مستقل منڈی بنا رہے۔ یہاں کے لوگ جو روپیہ زراعت سے کمائیں وہ غیر ملکی مصنوعات کے خریدنے پر خرچ

Sanjh Lok Raj

کر دیں اس طرح دولت کا بہاؤ زرعی ممالک سے صنعتی ممالک کو جاری رہے اور زرعی ملکوں کی بدحالی کو قائم رکھ کر صنعتی ممالک خوشحال رہیں۔

زراعت پر جامد معاشی کالونیل ڈھانچے کی حفاظت کے لیے سامراجیوں نے ہندوستان میں جاگیرداری رائج کی۔ حالانکہ انہوں نے اپنے ممالک میں جاگیرداری لڑ کر ختم کر دی ہوئی تھی کیونکہ جاگیردار طبقہ ان کی صنعتی ترقی میں سب سے بڑی رکاوٹ تھا جاگیرداری ایک طرح سے کالونیل مفادات کے قلعے کی پہلی حفاظتی دیوار ہے۔

اس کے بعد کالونیل معاشی ڈھانچے کی دوسری حفاظتی دیوار وہ تعلیمی نظام تھا جو ہماری معیشت کو زراعت پر جامد رکھنے کے لیے رائج کیا گیا۔ تاکہ یہ غیر پیداواری تعلیمی نظام صنعتی ممالک کی مصنوعات کی کھپت ہندوستانی منڈی میں بڑھانے میں معاون ہو۔

کالونیل معاشی ڈھانچے کی حفاظت کے لیے قلعے کی تیسری دیوار بیوروکریٹک انتظامی، سیاسی و عدالتی ڈھانچہ ہے اور ان سب پر سب سے مضبوط مسلح و منظّم فوج کی حفاظتی دیوار بنائی گئی۔ آج تک آپ کو ان تمام اداروں کی وفاداری برطانوی سامراج کے کالونیل دور کے دوسرے مرحلے میں تشکیل دیے گئے ڈھانچے سے نظر آ رہی ہو گی۔ کالونیل معاشی مفادات اور اس پر محافظ سیاسی نظام کو ہم اس طرح دیکھ رہے ہیں۔

فوج
بیوروکریسی عدلیہ سیاسی ڈھانچہ
غیر پیداواری نظام تعلیم
جاگیرداری
کالونیل معاشی مفادات کا قلعہ
زرعی معیشت
پہلی حفاظتی دیوار
دوسری حفاظتی دیوار
تیسری حفاظتی دیوار
چوتھی حفاظتی دیوار

Sanjh Lok Raj

سامراجیت محکوم ملک کے سماجی ڈھانچے سے الگ صرف خارجی چیز نہیں۔ ہماری معیشت اور معاشرت کی داخلی بناوٹ کا تقاضا یہ ہے کہ خارج میں ہم سامراج کے غلام رہیں۔ جس طرح سرمایہ دار ملکوں میں صنعت کاری ارتقاء پذیر ہو رہی تھی اس طرح یہ ملک مقبوضہ ممالک کے معاشی و سیاسی ڈھانچے کی اپنے مفادات کے تابع تشکیل نو کر رہے تھے۔

Sanjh Lok Raj

مالیاتی سرمایہ کا دور
1900-1939

مالیاتی سرمایہ نقد روپے کو کہتے ہیں۔ یہاں نقد روپے کا مطلب ہے ''بنک''۔ زراعت کے دور میں تو بچتوں کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ البتہ تجارتی دور میں یورپ کے تاجروں نے دستکاروں اور کاریگروں کا مال بیچ کر بہت روپیہ بنایا۔ تجارتی سرمایہ داروں کے کمائے ہوئے منافع کے یہ ڈھیر صنعتیں لگانے کے کام آئے۔ پھر صنعت کاروں نے اپنے کارخانوں کا مال بیچ کر ساری دنیا سے رقم اکٹھی کی۔ صنعت کاروں کی کمائی ہوئی دولت تاجروں کے کمائے ہوئے منافع سے ہزاروں لاکھوں گنا زیادہ تھی۔ اس طرح اب صنعتی ممالک کے بنکوں میں نقد روپے کے انبار لگ گئے۔ بنک یہ رقم سود پر چڑھاتے تھے، صنعت کاروں کو دیتے تھے اور حکومتوں کو قرض دیتے تھے بانڈ جاری کرتے تھے۔ اس طرح نقد روپے نے صنعتی سرمایہ سے اپنی الگ حیثیت اختیار کر لی۔ یہاں تک کہ مالیاتی سرمائے نے صنعتی سرمایہ پر کنٹرول حاصل کر لیا۔ صنعتی ترقی اور صنعتی بربادی نقد روپے کی دستیابی اور عدم دستیابی کے ماتحت ہوگئی۔ نقد روپے نے اس طرح کے کاروباروں میں اتنا روپیہ کمایا کہ صنعتی سرمایہ کا کمایا ہوا روپیہ اس کے آگے آٹے میں نمک کے برابر ہو گیا۔ اس لیے اس کو مالیاتی سرمایہ کا دور کہتے ہیں۔

مالیاتی سرمایہ نے خود صنعتی ممالک کے اندر اور مقبوضہ ممالک میں کیا کردار ادا کیا؟

کچھ سرمایہ داروں نے بنک سے پیسہ لے کر اپنی صنعتوں کو ترقی دی۔ پیداوار میں کئی گناہ اضافہ کیا۔ اپنا مال سستا بیچنا شروع کر دیا۔ جس کی وجہ سے سخت کاروباری مقابلے شروع ہوگئے۔ اور نتیجہ یہ کہ بنکوں کے سرمائے سے چلنے والی صنعتیں اپنی زیادہ پیداوار اور سستے

Sanjh Lok Raj

مال کی وجہ سے چھوٹی صنعتوں کو دیوالیہ کر گئیں۔ اس طرح مقابلہ ختم ہونے کے بعد بڑے سرمایہ داروں نے یہ صنعتیں خرید لیں یا انہیں اپنے اندر ضم کر لیا۔ اس طرح مالیاتی سرمائے نے اجارہ داریاں قائم کیں۔ اور بڑے بڑے پیداواری ادارے بنکوں کے کنٹرول میں چلے گئے۔ بنکوں کا کام تھا کہ معاشرے کے پورے خوشحال طبقے کی فالتو آمدنی جمع کریں اور اسے صنعتوں یا متعلقہ کاروباروں میں لگانے کے لیے صنعت کار کو دیں اور نقد روپیہ سے مزید روپیہ کمائیں۔ اس عمل میں صنعتی اجارہ داریوں کا قیام عمل میں آیا اور ساتھ ہی ساتھ بنکوں کی اجارہ داریاں بھی قائم ہوئیں۔

بیسویں صدی کے آغاز میں امریکہ اور یورپ میں بجلی کی مشینیں استعمال ہونے لگیں۔ بلب، ٹائپ رائٹر، فوٹوگرافی، ڈیزل انجن اور ہوائی جہاز ایجاد ہوا۔ ربڑ اور سیمنٹ کی پیداوار شروع ہوئی۔ پٹرول اور ڈیزل استعمال ہونے لگے۔ کوئلے اور لوہے کی پیداوار میں اضافہ ہوا۔ یہ کاروبار اتنے بڑے تھے کہ کوئی ایک شخص نہ تو اتنی رقم مہیا کر سکتا تھا اور نہ ہی اسے اکیلا سنبھال سکتا تھا۔ چنانچہ اب شخص کی جگہ کمپنی نے لے لی۔ اب کمپنی کو دو طریقوں سے رقم فراہم کی جا سکتی تھی۔ 1- بنک 2- حصص کی خرید و فروخت۔

بنکوں کے پاس اتنا سرمایہ تھا کہ بنکوں نے خود کمپنیاں بنانی شروع کر دیں۔ جس سے اجارہ داریوں کو فروغ ملا۔ اجارہ داری کا مطلب ہے مارکیٹ میں مقابلہ کرنے والوں کو ختم کر کے اکیلے ہی قابض ہو جانا۔ آج کے زمانے میں اجارہ داری کی ایک مثال بل گیٹس کے سوفٹ ویئر کا کاروبار ہے۔ وہ کھربوں روپے کا مالک ہے۔ وہ کسی بھی نئی ابھرنے والی کمپنی کے مارکیٹ میں مال کے مقابلے میں اپنے مال کی قیمت کم کر کے اُسے دیوالیہ کر سکتا ہے۔ پھر اجارہ داروں کا کام یہ ہوتا ہے کہ مارکیٹ میں مقابلہ ختم کرنے کے بعد اپنی من مرضی کی قیمت وصول کر کے گھاٹا پورا کر لیتے ہیں۔

1870 میں راک فیلر نے سٹینڈرڈ آئل کمپنی بنائی۔ ان دنوں تیل صاف کرنے کے کارخانوں میں اضافہ ہو رہا تھا اور تیل کی قیمتیں گر رہی تھیں۔ راک فیلر نے ریل کی کمپنی سے خفیہ معاہدہ کے ذریعے تیل کی باربرداری کا کرایہ کم کروا لیا۔ ریلوے دوسری کمپنیوں سے زیادہ کرایہ وصول کرتی تھی۔ دو سال میں کلیولینڈ کی تیل کی تمام کمپنیاں دیوالیہ ہو گئیں۔

Sanjh Lok Raj

1872 میں راک فیلر نے 26 میں سے 20 کارخانے خرید لیے۔ اور اگلے چار سال میں مشرقی امریکہ کے سارے کارخانے راک فیلر کی ملکیت بن چکے تھے۔ راک فیلر نے تو اپنی تیل کی باربرداری ریلوے کے ذریعے جاری رکھی مگر دوسرے کارخانے بک جانے کی وجہ سے ایمپائر ٹرانسپورٹ کمپنی کو نقصان ہونے لگا اور بالآخر ایمپائر ٹرانسپورٹ کمپنی بھی راک فیلر کے ہاتھوں بک گئی۔

خواہ وہ امریکہ ہو یا فرانس، جرمنی ہو یا انگلستان زیادہ سے زیادہ منافع کمانے کے لیے جو نیا طریقہ وجود میں آیا وہ محض مال بنانے اور بیچنے کا طریقہ نہیں تھا۔ بلکہ وہ اجارہ داری قائم کرنے، چھوٹے صنعت کاروں کو ہڑپ کرنے، مزدوروں کو کچلنے اور صارفین سے زیادہ سے زیادہ منافع کمانے کا طریقہ تھا۔ 20 ویں صدی کا آغاز سرمایہ داری میں اجارہ داریاں قائم ہونے سے ہوا۔ ان اجارہ داریوں کے ساتھ ساتھ زیادہ سے زیادہ منڈیوں پر قبضہ کرنے کے لیے اسلحہ کی دوڑ شروع ہوئی۔ مشین گن اور ڈائنا مائیٹ کی ایجاد نے اب جنگی آلات کو اور بھی خوفناک بنا دیا۔ یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ سرمایہ داری کے حامیوں کا یہ موقف مالیاتی سرمایہ داری کے دور میں مکمل طور پر غلط ثابت ہو گیا کہ اس نظام میں ہر کاروباری شخص دوسرے کاروباری سے مقابلہ کر سکتا ہے اور ہر شخص کو کاروبار کرنے کی مکمل آزادی ہے۔ یہ موقف صنعتی انقلاب کے ابتدائی دور میں تو بالکل صحیح تھا۔ یعنی جب اجارہ داریاں وجود میں نہیں آئی تھیں لیکن انیسویں صدی کے آخر تک چھوٹے سرمایہ داروں کے پھلنے پھولنے کا زمانہ ختم ہو گیا کیونکہ وہ اجارہ داریوں کے سامنے ٹھہر ہی نہیں سکتی تھیں۔ کالونیوں میں صنعتوں کے ابھرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ یہی تو سامراج ہے۔ یعنی سرمایہ داری کا اجارہ داری میں تبدیل ہونا سامراج کی ترقی یافتہ شکل ہے۔ اس طرح جن سرمایہ دار ملکوں میں اجارہ داریوں نے پرورش پائی ان ہی ممالک میں جنگی جنون اور معاشی قوم پرستی کے خیالات کو پروان چڑھانا اجارہ داریوں کے لیے تقویت کا باعث سمجھا جا رہا تھا۔ یہ تو تھیں وہ تبدیلیاں جو نقد روپے کی بہتات کی وجہ سے خود سرمایہ دار ممالک میں رونما ہو رہی تھیں۔ مگر ساتھ ہی ساتھ مالیاتی سرمایہ نے مقبوضہ ممالک میں بھی بہت اہم کردار ادا کیا جس طرح پانی ڈھلان کی طرف بہتا ہے اس طرح نقد سرمایہ بھی وہاں جاتا ہے جہاں منافع زیادہ ہو۔ سامراجی ملکوں میں منافع کی شرح کم

ہوگئی تھی۔ مقبوضہ ممالک میں مزدوری بہت کم تھی۔ زمین سستی تھی۔ خام مال بھی دستیاب تھا۔ اس لیے وہاں سرمایہ لگانے کے لیے فضا سازگار تھی۔ چنانچہ سامراجی ملکوں سے مقبوضہ ملکوں کو سرمائے کی برآمد شروع ہوئی۔ نقد سرمایہ نے قرض کی شکل میں حکومتوں اور مختلف طبقات کی قوت خرید میں اضافہ کیا۔ صرف برطانیہ کی صنعت نے پورے گلوب پر ریلوں کا جال نہیں بچھایا بلکہ برطانیہ کے قرضوں نے اسے ممکن بنایا۔ صنعتی سرمایہ داری کے دور تک جو ممالک صرف مصنوعات کی منڈی تھے وہاں مالیاتی سرمایہ کے عروج کے بعد برطانوی سرمایہ داروں نے خود ہی اس ہندوستانی صنعت کو ترقی دی جس کی ٹکر انگریزی مصنوعات سے نہیں ہوتی تھی۔

آج مالیاتی سرمایہ کے کردار کو سمجھنے کے لیے پاکستان کی ایک مثال کو مدِنظر رکھیں تو یہ کہ پاکستان کے کسان امریکی فورڈ ٹریکٹر خریدنے کے قابل نہیں تھے اور اس طرح وہ فیلڈ مارشل ایوب خان کے سبز انقلاب میں شرکت کرنے کی سکت نہیں رکھتے تھے۔ یعنی ان کی قوت خرید کمزور تھی۔ اُدھر امریکی کمپنی فورڈ کے پاس ٹریکٹر کی فالتو پیداوار گوداموں میں گل سڑ رہی تھی۔ دونوں کے مسائل کے حل کے لیے امریکی قرضے سے پاکستان میں زرعی بنک کا قیام عمل میں لایا گیا۔ تاکہ کسان کو قرض دے کر اس کی زمین گروی رکھ کر فورڈ ٹریکٹر اور دیگر امریکی زرعی مصنوعات و آلات کی خرید کے قابل بنایا جائے۔ اس طرح قرض دینے کی شرط ابتدائی سالوں میں یہی تھی کہ وہ قرض کی اس رقم سے صرف امریکی مصنوعات ہی خرید سکتا ہے۔ اس طرح قرض کا نقد روپیہ واپس امریکہ چلا گیا۔ امریکی مصنوعات بک گئیں۔ مگر کسان ساری زندگی کے لیے رقم بمعہ سود واپس کرنے کے لیے پابند ہوگیا۔

☆ صنعتی سرمائے اور بنکوں میں جمع شدہ نقد سرمائے کے مل جانے سے اجارہ داریاں بنیں اور سرمائے کی نوعیت صنعتی سے مالیاتی ہوگئی۔

☆ صنعتی مال کی برآمد کے علاوہ بڑی مقدار میں نقد سرمائے کی برآمد شروع ہوئی۔

☆ بین الاقوامی اجارہ داریاں بنیں اور دنیا کی معاشی تقسیم ہوگئی۔

☆ معاشی قوم پرستی اور اسکی حفاظت کے لیے جنگی جنون کو پروان چڑھایا گیا

☆ اجارہ داریوں نے اندرون ملک مقابلہ ختم کرنے کے بعد دنیا پر چڑھائی کی تیاریاں شروع کر دیں۔

Sanjh Lokraj

منڈیوں کی چھینا جھپٹی کے لیے دو عالمی جنگیں

سرمایہ داری منڈیوں کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی اور پیداوار کے لیے خام مال کی ضرورت ہوتی ہے۔ سرمایہ داری جب اجارہ داریوں میں تبدیل ہوئی تو بڑے پیمانے پر پیداوار شروع ہوگئی۔ بڑے پیمانے پر پیداوار کے لیے زیادہ خام مال اور کھپت کے لیے وسیع منڈیوں کی ضرورت تھی۔ اس ضرورت کے پیش نظر سامراجیوں میں پوری دنیا کے خام مال معدنیات اور منڈیوں پر قبضے کی خواہش بڑھ گئی۔ آدھی سے زیادہ دنیا تو پہلے ہی ان کے قبضے میں تھی۔ باقی دنیا پر قبضے شروع ہوگئے۔ جن ممالک نے بعد میں صنعتی ترقی کی ان کی پیداوار کی کھپت کے لیے منڈیاں موجود نہیں تھیں کیونکہ ان پر پہلے ہی سے قبضہ ہو چکا تھا۔ یہ قبضہ فوجی طاقت اور اسلحہ کے زور پر قائم بھی تھا۔ تمام یورپی طاقتیں اپنی فوجی قوت میں روز بروز اضافہ کر رہی تھیں۔ 1870 سے سارے یورپ میں جبری بھرتیاں شروع ہو چکی تھیں۔ فوجی طاقت میں اضافے کے ساتھ ساتھ صنعتی ممالک کے جرنیل فیصلہ سازی میں اپنا اثر رسوخ بڑھا رہے تھے اور سول اِنتظامیہ سے طاقتور ہوتے جا رہے تھے۔ اس طاقت نے تاریخ کی حرکت کو اب اپنے ہاتھ میں لے لیا تھا۔ پہلی جنگ عظیم یک دم نہیں پھوٹ پڑی کہ ساری دنیا اس کی لپیٹ میں آ گئی۔ بلکہ چھوٹی موٹی جنگیں، جھڑپیں ایک دوسرے کے علاقوں پر قبضے 1870 سے شروع ہوگئے تھے۔ 1870 میں جرمنی نے فرانس کے کوئلہ پیدا کرنے والے دو صوبوں پر قبضہ کر لیا تھا۔ مراکش پر قبضے کے لیے جرمنی اور فرانس میں لڑائی ہوئی۔ مراکش معدنیات سے بھرپور ملک تھا۔ 1871 میں جاپان نے اندرونی انقلاب کے ذریعے جاگیرداری ختم کر کے صنعتی ترقی کی راہ اپنا لی تھی۔ مگر جاپان اتنا چھوٹا ملک تھا کہ اسے خام مال اور منڈی کے لیے وسیع علاقے پر قبضہ کرنا تھا۔ اسکی نظریں چین پر تھیں۔ اس کے برعکس امریکہ ایک وسیع و عریض

Sanjh Lok Raj

ملک تھا۔ اگر وہ اپنے اردگرد کے ممالک پر قبضہ نہ بھی کرتا تب بھی اپنی سرمایہ داری کو زندہ رکھ سکتا تھا۔ دنیا کی اس غیر ہموار صنعتی ترقی کا نتیجہ یہ نکلا کہ اسلحہ کی دوڑ کے ساتھ ساتھ بعد میں صنعتی ترقی کرنے والے ممالک کو اپنی صنعت کو غیر ملکی مصنوعات پر کسٹم ڈیوٹیاں لگا کر بچانا پڑا۔ جرمنی میں یہ ڈیوٹیاں سخت تھیں اور سرمایہ دار ممالک نے کسٹم ڈیوٹیوں کے ذریعے اندرون ملک معاشی قوم پرستی کے جذبات کو فروغ دیا۔ اپنی قومی صنعتوں کو غیر ملکی یلغار سے بچانے کے لیے ٹیکس کی دیوار کھڑی کی گئی۔

اپنی قومی صنعت کے تحفظ اور اپنی منڈیوں پر قبضہ برقرار رکھنے کے لیے فوجی طاقت کے ساتھ ساتھ عوامی حمایت حاصل کرنے کے لئے فرانس، برطانیہ، جرمنی، اٹلی، روس، آسٹریلیا، ہنگری میں قوم پرستی کی تحریکیں پروان چڑھائی گئیں۔ یہ قوم پرستی ایک دوسرے کے خلاف آگے بڑھ رہی تھیں۔ اسی معاشی قوم پرستی نے منڈیوں کے بارڈر کھچوائے جنہیں ہم کسی ملک کی سرحدیں کہتے ہیں ورنہ اس سے پہلے کوئی بھی شخص پوری دنیا میں بلا روک ٹوک کہیں بھی جا سکتا تھا۔1890 میں جرمنی کی مصنوعات پوری دنیا میں برطانوی مصنوعات کا مقابلہ کر رہی تھیں۔1895 میں جاپان نے کوریا کو چین سے الگ کر لیا اور تائیوان پر بھی قبضہ کر لیا۔ جاپان کی طرح جرمنی کا حکمران طبقہ بھی دنیا کی منڈیوں اور نوآبادیوں کی ازسرنو تقسیم چاہتا تھا۔ روس کا صنعت کار مشرقِ وسطیٰ پر قابض ہونا چاہتا تھا جہاں جرمنی کا پہلے ہی سے اثر تھا۔ اس طرح جنگ مراکش، بحران بوسنیا اور بلقان کی جنگوں کے ایک سلسلے کے بعد اگست1914 میں پہلی عالمی جنگ شروع ہوئی اور1919 میں ختم ہوگئی۔ اس جنگ کے نتیجے میں۔

☆یورپی ممالک کی قومی سرمایہ داریاں، اجارہ داریاں، مقبوضات قائم رہے۔ جرمنی کو مقبوضات گنوانی پڑیں

☆ روس میں زار روس کی سلطنت ختم ہوگئی اور انقلاب عظیم رونما ہوا۔

☆ جاپان کو چین پر اقتدار حاصل ہوگیا۔

☆ سلطنت عثمانیہ کے پرخچے اڑ گئے۔ آسٹریا ہنگری ختم ہو گئے نئی سلطنتیں وجود میں آئیں

Sanjh Lok Raj

☆ پہلی عالمی جنگ کے بعد امن کے کئی سطحی معاہدے ہوئے۔ جو سامراج ممالک کے آپس میں ٹکرانے والے تضادات کو حل کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتے تھے۔ جسکی وجہ سے ان ہی وجوہات پر دوبارہ لڑائیاں شروع ہوگئیں۔

دوسری عالمی جنگ (1939-1945)

منڈیوں کی چھینا چھپٹی کے لئے لڑی گئی پہلی عالمی جنگ میں ایک کروڑ انسانوں نے جان گنوائی 20 کروڑ زخمی ہوئے۔ جنگ کی تباہ کاریوں کے اثرات سامراجی دنیا میں معاشی بد حالی کی شکل میں رونما ہوئے۔ بنکوں کے دیوالیے نکل گئے۔ 30 کروڑ مزدور بے روزگار ہوئے پیداوار میں کمی واقع ہوئی۔ جنگ کے دوران جو نوٹ چھاپے گئے تھے وہ لوگوں کے پاس موجود تھے مگر ان سے خریدنے کے لیے بازار میں کچھ نہیں تھا۔ اتنی بڑی تباہی اور بدحالی کے باوجود صنعتی ممالک کا منڈیوں کی ازسرنو تقسیم والا بنیادی تضاد حل نہیں ہوا تھا۔ جس کے لیے منڈیوں سے محروم ممالک اندر ہی اندر تیاری کرتے رہے۔

جرمنی، اٹلی اور جاپان ایسے سامراجی تھے جن کا خیال تھا کہ انہیں دنیا کی لوٹ میں پورا حصہ نہیں مل رہا۔ اب تک سامراجی لوٹ کا جو عالمی نظام رائج تھا۔ وہ پسماندہ ممالک پر فوجی طاقت کے ذریعے قبضے کے بل بوتے پر قائم تھا۔ نئے ابھرنے والے سامراجیوں کا خیال تھا کہ ان کے پورے حصے کے حصول میں مغربی ممالک کی فوجی قوت حائل ہے۔ منڈیوں کی ازسرنو تقسیم مغربی ملکوں کی فوجی قوت کو تباہ کر کے ہی ممکن ہے۔ جرمنی کا متوسط طبقہ اپنی ذلت آمیز شکست کا بدلہ لینا چاہتا تھا۔ جاپان کے سامراجی مطالبے امریکہ کے مفادات سے ٹکرا رہے تھے۔ جاپان کی روس اور ایشیاء کے دیگر ممالک پر قبضے کی خواہش پر امریکہ کو کوئی اعتراض نہیں تھا بس امریکہ چین کو اپنے ہاتھ سے نکلنے نہیں دینا چاہتا تھا برطانیہ لڑائی کا خواہشمند نہیں تھا کیونکہ وہ تو پہلے ہی دنیا کے ایک بڑے حصے پر قابض تھا۔

ستمبر 1939 میں جرمنی نے پولینڈ پر حملہ کر دیا جس سے دوسری عالمی جنگ شروع ہوئی۔ جون 1940 میں اٹلی بھی جرمنی کی حمایت میں فرانس اور برطانیہ کے خلاف میدان

Sanjh Lok Raj

میں آ گیا۔ جون 1941 میں جرمنی نے روس پر حملہ کر کے تباہی مچادی جس سے ہٹلر کی یہ جنگ عالمی بن گئی۔ 7 مئی 1945 کو جرمنی کی فوجوں نے ہتھیار ڈال دیے جس سے یورپ میں لڑائی بند ہوگئی مگر امریکہ نے اتحادیوں کے 9 اگست کو جنگ بند کر دینے کے اعلان کے باوجود جاپان پر ایٹم بم چلائے جس سے 3 لاکھ جاپانی مارے گئے۔ 14 اگست کو جاپان نے اتحادیوں کی طرف سے عائد کی گئی شرائط قبول کرلیں اس طرح دوسری عالمی جنگ ختم ہوگئی۔ مگر یہ اتنا سادہ نہیں تھا۔

دوسری جنگ عظیم نے دنیا کو ایک نئے تاریخی سفر پر روانہ کر دیا۔ قومی سرمایہ داریاں جو الگ الگ سامراجی سفر پر چل رہی تھیں ایک عالمی سرمایہ داری نظام میں تبدیل ہوگئیں۔

جنگ جاری رہی اور سامراجی ممالک آپس میں بیٹھ کر یہ منصوبہ بندی بھی کرتے رہے کہ کس طرح آئندہ آپس میں جنگ کیے بغیر پرامن طریقے سے مذاکرات کی میز پر بیٹھ کر منڈیوں اور دنیا کے وسائل کو تقسیم کرلیا جائے۔ اس کام کے لیے عالمی ادارہ قائم کیا جائے جو سرمایہ داری کے عالمی مفادات کا محافظ ہو۔ اور ان کے آپس کے تضادات بھی حل کرے۔ اس طرح اقوام متحدہ کے قیام کی راہ ہموار کی جارہی تھی۔

جولائی 1941 ہی میں امریکہ کے صدر روز وہلٹ اور برطانیہ کے وزیراعظم چرچل کے درمیان سمندری جہاز میں ایک ملاقات ہوئی۔ امریکہ جنگ میں کود پڑا۔ لیکن اس نے کچھ شرائط رکھیں جسے منشور اوقیانوس (Atlantic Charter) کہتے ہیں۔ یکم جنوری 1942 کو واشنگٹن میں 26 ممالک نے منشور اوقیانوس میں بیان کردہ اصولوں پر اتفاق کیا اور اعلان کیا کہ سب مل کر جرمنی، جاپان اور اٹلی کو شکست دیں گے۔ اس منشور کے ذریعے دنیا کے خام مال معدنیات اور منڈیوں پر تمام صنعتی ممالک کا برابر کا حق تسلیم کرلیا گیا۔ ساری دنیا کے لوگوں کو سارے سمندروں میں بلا روک ٹوک جانے کی اجازت ہوگئی۔ کیونکہ سمندر کے بغیر عالمی تجارت ممکن نہیں تھی۔ جرمنی اور جاپان کو غیر مسلح کرنے کا فیصلہ کرلیا گیا۔ اس طرح جنگ عظیم دوئم کے خاتمے کے بعد نئے عالمی سامراجی نظام کی بنیاد رکھ لی گئی۔

قومی سرمایہ داریوں کی عالمی سرمایہ داری میں ڈھالنے کے لیے امریکی وزیر خارجہ کورڈیل ہل نے مارچ 1944ء میں سترہ نکات پیش کیے۔ جس کا مرکزی نکتہ یہ تھا۔

Sanjh Lokraj

بین الاقوامی تجارت کے راستے میں جو رکاوٹیں حائل ہیں انہیں ختم کر دینا چاہیے۔ قومی کرنسیوں کے تبادلے پر سے پابندی ختم کی جائے۔ ایسا مالی نظام قائم کیا جائے کہ ہر جگہ سے پیداوار آسانی سے دنیا کی منڈیوں میں پہنچائی جا سکے اور سرمایہ بھی ایک جگہ سے دوسری جگہ آسانی سے لایا اور لے جایا جا سکے۔ بعد میں اس کو آزاد تجارت کا نام دیا گیا۔

آزاد منڈی کی تجارت کے لیے ٹیرف میں کمی کے علاوہ سرمایہ دار ملکوں میں تجارتی توازن قائم رکھنے کے لیے کرنسیوں کی قیمت کا تعین اور اس طرح ادائیگیوں کا عالمی نظام قائم کرنا تھا تاکہ عالمی سرمایہ داری کی راہ ہموار ہو۔

یار ہے کہ ٹیرف اپنے ملک کے سرمایہ دار کو غیر ملکی مال کے مقابلے سے تحفظ دینے کے لیے حکومتیں درآمدی مال پر بھاری ڈیوٹیاں عائد کر دیتی ہیں۔ ایسے ٹیکسوں سے ملک کی صنعت کو حفاظت مل جاتی ہے۔

زرمبادلہ کا مطلب ہوتا ہے کسی ایسے دوسرے ملک کی کرنسی حاصل کرنا جس کرنسی میں بین الاقوامی تجارت ہوتی ہو یا جو اتنی مضبوط ہو کہ تجارتی کرنسی میں آسانی سے تبدیل کی جا سکے۔ یہ زرمبادلہ دوسرے ملکوں میں اپنی چیزیں فروخت کر کے اور دوسرے طریقوں سے حاصل کیا جاتا ہے۔ یورپ میں جنگ عظیم دوئم نے تباہی مچادی تھی اور یورپی سامراجی ملکوں کی پوری دنیا سے لوٹی ہوئی دولت اسلحہ کی خرید کی شکل میں امریکہ منتقل ہو رہی تھی۔ امریکہ چاہتا تھا کہ ڈالر کو عالمی تجارتی کرنسی کے طور پر رائج کروالیا جائے۔

دوسری عالمی جنگ کے دوران مغربی ماہرین معاشیات کی ایک کانفرنس امریکہ کے شہر بریٹن وڈز میں جولائی 1944ء میں ہوئی۔ اس کانفرنس میں بین الاقوامی مالیاتی فنڈ اور عالمی بنک جیسے ادارے وجود میں آئے۔ عالمی ادائیگی کا نظام جس پر برطانیہ کی بالادستی تھی اور غیر ملکی سرمایہ کاری کی اصل روح تھی IMF اور عالمی بنک کی تشکیل کے دوران امریکہ نے ہائی جیک کر لی۔ مالیاتی فنڈ کا دستور اس طرح بنایا گیا کہ اس پر امریکہ کا غلبہ ہو۔ اس کے قواعد و ضوابط کے تحت یہ پابندی عائد کی گئی کہ کوئی ملک اس ادارے کی منظوری کے بغیر اپنی کرنسی کی قیمت میں کمی بیشی نہیں کرے گا۔ اور زرمبادلہ کی خرید و فروخت بھی اس ادارے کی منظوری سے ہو گی۔ اس طرح سامراجی ممالک نے پس ماندہ ممالک کی معیشتوں پر کنٹرول حاصل کرنے

Sanjh Lok Raj

اور آپس کے مشترکہ سامراجی مفادات کو سہارا دینے کی منصوبہ بندی کی۔ دوسری جنگ عظیم کی وجہ سے برطانوی سامراج کا عالمی اقتدار کمزور پڑ گیا۔ ایک طرف سوشلسٹ ممالک کے بلاک کا قیام عمل میں آچکا تھا اور دوسری طرف امریکہ دنیا کا سب سے مضبوط سامراجی ملک بن کر سامنے آ گیا۔ سرمایہ دار ملکوں کی اجارہ داریاں اب ملٹی نیشنل کمپنیوں میں تبدیل ہوگئیں اور آئندہ کے لیے سرمایہ دار ملکوں کے درمیان منڈیوں کی پرامن تقسیم ہوگئی۔

Sanjh Lok Raj

بریٹن وڈز سسٹم
1944-1947

یہ قومی سرمایہ دار ریاستوں کا عالمی سرمایہ داری میں تبدیل ہونے کا پہلا سوچا سمجھا منصوبہ تھا۔ 1930ء کے عالمی معاشی بحران کے بعد سرمایہ دار ممالک نے اپنی قومی معیشتوں کو سہارا دینے کے لیے ریاستی کنٹرول بڑھا دیا تھا۔ اندرون ملک گرتی ہوئی معیشت کو سنبھالنے کے لیے غیر ملکی مصنوعات پر بھاری ٹیکس عائد کر دیئے تھے جسے ٹیرف کہتے ہیں۔ ان ممالک نے کرنسی کی قیمتوں میں اپنے طور پر کمی کر لی تھی تا کہ ان کی برآمدات بڑھیں اور ساتھ ہی ساتھ اپنی کرنسیوں کی قیمت مقرر کرنے میں سونے کے معیار کو ختم کر دیا تھا۔ اسی معاشی بحران کے دوران برطانیہ نے اپنا معاشی بلاک تشکیل دے لیا تھا۔ تا کہ امریکی مصنوعات کو دنیا کی منڈیوں میں داخل ہونے سے روکا جائے۔ دوسرے صنعتی ملکوں نے بھی اپنی کرنسیوں میں امریکی ڈالر کیمقابلے میں جان بوجھ کر صرف اس لیے کمی کی تھی کہ امریکی عالمی تجارت آگے نہ بڑھ سکے۔

1930ء کے معاشی بحران کی وجہ سے برے حالات میں عام لوگوں کا سرمایہ دارانہ معیشت کے خلاف ہونا ایک قدرتی امر تھا۔ اور مقابلے میں روس کی سوشلسٹ ریاست موجود تھی۔ جس میں ریاست کے ہر شہری کی بنیادی ضرورتیں پوری کرنا ریاست کی ذمہ داری تھی۔ سرمایہ دار ممالک کبھی یہ نہیں چاہتے تھے کہ اندرون ملک اور دنیا میں ایسے حالات پیدا ہوں کہ روس جیسا انقلاب آ جائے۔ اس لیے اب یورپ کی سرمایہ دار ریاستوں میں فلاحی ریاست کا تصور ابھرا۔ فلاحی ریاست منصوبہ بند معیشت ہی کے ذریعے ممکن تھی۔ بے روزگاری میں کمی، پیداوار میں اضافہ اور فرد کی معاشی حالت کو سدھارنا ریاست کا فرض سمجھا جانے لگا۔

Sanjh Lok Raj

ان نظریات کو ریاستی سطح پر منوانے کے لیے کینز سکول آف اکنامکس کا کردار بھی اہم تھا۔

منصوبہ بند معیشت سے اندرون ملک معیشت کو تو سہارا ملا مگر عالمی تجارت پر منفی اثرات پڑے۔ دنیا کے خام مال اور مارکیٹوں تک رسائی کے لیے منشور اوقیانوس میں جن نکات پر سرمایہ دار ممالک اکٹھے ہوئے تھے اب انہیں حتمی شکل دینے کا وقت آ گیا تھا۔ سوشلسٹ نظریات اور روسی انقلاب کے بعد سرمایہ داری نظام الگ الگ قومی ریاستوں کے الگ الگ استحصال کرنے کے فارمولے پر زندہ نہیں رہ سکتا تھا۔ اسے اب زندہ رہنے کے لیے استحصال کی ایک عالمی شکل اختیار کرنا تھی۔

عالمی تجارت کے لیے کوئی ایسا ادارہ بھی نہیں تھا جو ادائیگیوں اور سرمایہ کاری پر کنٹرول رکھے۔ اس کام کے لیے بریٹن وڈز کانفرنس میں دو عالمی ادارے قائم کیے۔ جو IMF اور IRBD جو کہ آج کل عالمی بنک کا حصہ ہے قائم کئے گئے IMF کی تشکیل اس طرح کی گئی کہ اس پر امریکی بالادستی قائم رہے۔ اوائل میں اس کا مقصد سرمایہ دار ملکوں کے درمیان ادائیگی کا توازن اور زرمبادلہ کے مسائل سے نمٹنا تھا۔ اب یہ ادارہ ان دو مقاصد کے علاوہ پسماندہ ملکوں کی مالی پالیسیوں کو سامراجی مفادات سے ہم آہنگ کرنے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ جسے (Structural adjustment) کہتے ہیں۔ ہنگامی قرضے اور ''استحکامی'' پروگرام اس کے اہم ہتھیار ہیں۔

یعنی بریٹن وڈز سسٹم سرمایہ دار ممالک کے لیے اور قسم کی پالیسیاں رکھتا تھا اور پسماندہ ممالک کے لیے بالکل الگ قسم کی پالیسیاں رکھتا تھا۔ بیسویں صدی کے شروع میں بڑے بڑے صنعتی ملکوں نے اپنی کرنسیوں کی قیمت سونے کی مقدار کی بنیاد پر مقرر کر رکھی تھی۔ زرمبادلہ کے خسارے نہیں پڑتے تھے۔ جب کوئی ملک زیادہ مال خریدتا تھا تو زائد مال کی قیمت کی ادائیگی سونے میں ہوسکتی تھی۔ لیکن کسی ملک میں اگر ایسا کرنے سے سونے کے ذخیرے میں کمی آ جاتی تو اس ملک کی کرنسی کی قیمت دوسرے ملک کی کرنسیوں کے مقابلے میں کم ہو جاتی تھی۔ کرنسی کی قیمت میں از خود اس طرح کی کمی کی وجہ سے اس ملک کا مال باہر کے ملکوں میں سستا ہو جاتا تھا اور مزدوری بھی بیرونی کرنسیوں کے حوالے سے سستی ہو جاتی تھی۔ لیکن اندرون ملک عوام کے لیے چیزیں مہنگی ہو جاتی تھی۔ اور اندرون ملک سیاسی حالات

Sanjh Lok Raj

خراب ہو جاتے تھے۔ بریٹن وڈز سسٹم کے زریعے عالمی تجارت کو امریکی ڈالر سے جوڑ دیا گیا اور زرمبادلہ اب سونے کی بجائے امریکی ڈالر بن گیا۔

امریکہ کے اتحادیوں کو جنگ کی تباہی کے بعد عالمی سرمایہ داری پر امریکی مدد کی ضرورت تھی۔ برطانیہ اپنی تباہ شدہ صنعت کو بحال کرنے، خوراک اور خام مال کی خرید کے لیے امریکہ سے 4.4 بلین ڈالر کی مدد لینے پر مجبور ہوا۔ فرانس کا جنرل ڈیگال جو امریکہ سے اپنی نفرت کو کبھی چھپا نہیں پاتا تھا جنگ کے بعد امریکہ سے ایک بلین ڈالر کا قرضہ مانگنے پر مجبور ہوا بدلے میں امریکہ نے شرائط عائد کیں تا کہ اس کی مصنوعات امریکہ سے مہنگی ہو جائیں۔ تیسری دنیا معاشی و سیاسی لحاظ سے محکوم ہی رہی اور انہیں عالمی سرمایہ داری کے فیصلوں کے آگے جھکنا پڑا۔ بریٹن وڈز کے بعد جہاں سرمایہ داری عالمی ہو گئیو ہاں منڈی بھی عالمی ہوگی اس کے بعد عالمی منڈی کا لفظ استعمال ہونے لگا۔

Sanjh Lok Raj

قیام پاکستان
1947-1954

پاکستان 1947ء میں دوسری عالمی جنگ کے بعد ہندوستان کی تقسیم کے نتیجے میں اس وقت وجود میں آیا جب دوسری عالمی جنگ نے برطانیہ کی کمر توڑ دی تھی۔ اور وہ اب کالونیوں پر اپنا قبضہ برقرار رکھنے کے قابل نہیں رہا تھا۔ اور امریکی سامراج کا سورج پوری دنیا کے معاشی افق پر طلوع ہو چکا تھا۔ برطانیہ اگرچہ ہندوستان کو تقسیم کرنے کے فیصلے پر اپنا ذہن بار بار تبدیل کرتا رہا مگر امریکہ ہندوستان کی تقسیم ہی چاہتا تھا۔ آخرکار ہندوستان تقسیم ہو گیا۔ اب پاکستان کی نوآزاد ریاست کے سامنے دو راستے تھے۔

پہلا راستہ تو یہ تھا کہ برطانیہ نے دو سو سالہ قبضہ کے دوران جس محتاج معاشی ڈھانچے کی تشکیل کی تھی، اس معاشی سسٹم کا محافظ جو جاگیردار طبقہ پیدا کیا تھا، جو غیر پیداواری نظام تعلیم رائج کیا تھا، عدالتی اور انتظامی بیوروکریسی کا جو سیاسی ڈھانچہ تشکیل دیا تھا اور ان سب پر نگران جو برٹش انڈین آرمی تشکیل دی تھی، اس سسٹم میں کوئی بھی تبدیلی کیے بغیر اسے آگے چلایا جاتا اور انگریز کی بجائے بس مقامی لیڈروں کی نگرانی میں اسی کالونیل سسٹم کو جاری رکھا جاتا۔

دوسرا راستہ یہ تھا کہ کالونیل سسٹم کے متبادل ملک کو معاشی لحاظ سے اپنے پاؤں پر کھڑا کرنے کی منصوبہ بندی کی جائے۔ ایسی معیشت کے لیے لازمی طور پر ایسا نظام تعلیم رائج کیا جائے جو خود انحصار معیشت کے لیے مددگار ہو۔ بیوروکریسی منتخب نمائندوں کے ماتحت ہوتی، اپنے ملک کے معدنی وسائل کو خود استعمال کرتے اور ملک میں موجود اکثریتی طبقے کی پارلیمنٹ میں نمائندگی ہوتی۔

Sanjh Lokraj

مگر جاگیرداروں کا وہ طبقہ جو برطانوی سامراج نے اپنے مفادات کے محافظ کے طور پر پیدا کیا تھا اور ان میں سے جو سیاسی قیادت پروان چڑھائی تھی، بیوروکریسی کا جو طاقتور طبقہ پیدا کیا تھا، اور برٹش انڈین آرمی جس کا نام تبدیل کر کے پاک فوج رکھ دیا گیا تھا۔ ان کی موجودگی میں یعنی ان مادی حالات میں کیا فیصلہ ہوسکتا تھا؟ یقیناً کالونیل سسٹم کو جاری رکھنے کا فیصلہ ہوا۔ وہ بیوروکریسی جو کالونیل مفادات کے تحت تشکیل دی گئی تھی وہ اب پاکستان کی پالیسی سازی میں مستقل مرکزی کردار ادا کرے گی۔

اس کا عملی اظہار قائداعظم کے بیوروکریسی کے سربراہ کے طور پر یعنی گورنر جنرل کا عہدہ قبول کرنے سے ہوا۔ کالونیل معاشی ڈھانچہ جو ہمیں برطانوی سامراج سے ورثہ میں ملا تھا وہ سامراجی سرپرستی کے بغیر خود بخود چلنے کے قابل نہیں تھا۔ ادھر امریکہ نے سابقہ برطانوی نوآبادیوں پر اپنا تسلط جمانے کے لیے تکنیکی امداد کے نام سے ایک پروگرام شروع کیا جس کا کام سامراج کے لیے پسماندہ ممالک میں نئے ادارے تعمیر کرنے کے علاوہ سرکاری شعبوں اور تعلیمی اداروں کے عملے کی تربیت شامل تھے۔

پاکستان کے اندر حکومتی ڈھانچے میں ایسی تبدیلیاں لائی جا رہی تھیں جو امریکہ کے بالواسطہ اقتدار کے لیے راہ ہموار کریں۔ پاکستان کی تاریخ اس بات کا جواب دینے پر خاموش ہے کہ کس طرح ایک منجھے ہوئے سیاست دان گورنر جنرل خواجہ ناظم الدین کا عہدہ گھٹا کر انہیں وزیراعظم بنا دیا۔

اور ایک دفتری بیوروکریٹ میز کرسی سے اٹھ کر گورنر جنرل بن گیا اور اس طرح کروڑوں لوگوں کے مستقبل کا مالک بن گیا۔ مگر تاریخ کی اس خاموشی کا جواب ان فیصلوں میں چھپا ہے جو اس نے اپنے دور اقتدار میں کیے۔ وہی خواجہ ناظم الدین جو گورنر جنرل کا عہدہ چھوڑ کر وزیراعظم بنائے گئے تھے اپریل 1953ء میں برطرف کر دیئے گئے۔ اور ان کی جگہ امریکہ میں پاکستان کے سفیر محمد علی بوگرہ کو ملک واپس بلا کر وزیراعظم بنا دیا گیا۔ پاکستان کی پہلی آئین ساز اسمبلی موجود تھی جو پاکستان اور امریکہ کے تعلقات پر بات چیت کر سکتی تھی مگر چونکہ بیوروکریسی اور فوج امریکہ کے ساتھ دفاعی معاہدے کرنا چاہتے تھے اس طرح جو امداد آتی اس سے اربوں روپے ان کی جیبوں میں بھی جاتے۔ اس لیے اسمبلی کو 24 اکتوبر

Sanjh Lok Raj

1954ء کو توڑ دیا گیا۔ محمد علی بوگرہ کو دوبارہ وزارت بنانے کے لیے کہا گیا۔ اور مسلح افواج کے کمانڈر انچیف محمد ایوب خان کو وزیر دفاع بنا دیا گیا۔

اس طرح جو عمل گورنر جنرل کا عہدہ قبول کرنے سے 1947ء میں شروع ہوا تھا وہ 1954ء میں مکمل ہو گیا۔ یعنی بیوروکریسی کے تینوں حصے سول۔ ملٹری اور عدالتی بیوروکریسی ملک کے اقتدار پر قابض ہوگئی۔ اب پاکستان اور امریکہ کے درمیان دوفوجی معاہدوں پر دستخط ہوئے۔ امریکی مشیر ایک بڑی تعداد میں پاکستان آنا شروع ہوئے۔ ان مشیروں کی سرگرمیوں کا مرکز منصوبہ بندی کا ادارہ ''پلاننگ بورڈ'' تھا۔

پلاننگ بورڈ (1954-1958)

اقتصادی منصوبہ بندی روایتی سرمایہ دارانہ نظریہ کے منافی ہے جبکہ سوشلسٹ ممالک کے لیے منصوبہ بندی لازمی ہے۔ پاکستان میں کوئی سوشلسٹ انقلاب تو برپا نہیں ہوا تھا مگر پھر بھی اس میں اقتصادی منصوبہ بندی راج کر دی گئی۔ کیونکہ براہ راست کیا جانے ولا کالونیل راج خود بخود بغیر کسی اداراتی ترمیم کے بالواسطہ کیے جانے والے نیو کالونیل سسٹم یا جدید نوآبادیاتی نظام میں تبدیل نہیں ہو جاتا۔ نئی مملکت کے لئے حکمرانوں نے اگر یہ فیصلہ ہی کر لیا ہے کہ کالونیل سسٹم ہی کو آگے بڑھایا جائے تو معاشی اور سیاسی پالیسیوں کو جدید سامراج کی منشاء کے مطابق چلانے کے لیے ایسے ادارے وجود میں لائے جائیں جو جدید سامراج کے تسلط کو مقامی حکمرانوں کے اپنے مفادات سے ہم آہنگ کریں۔ جب بیوروکریسی نے اپنا اقتدار مستحکم کر لیا تو گورنر جنرل ملک غلام محمد نے پلاننگ بورڈ قائم کیا۔ حکومت پاکستان نے امریکہ کی ہارورڈ یونیورسٹی اور فورڈ فاؤنڈیشن کے ساتھ ایک سمجھوتے پر دستخط کیے جس کی بدولت بیرونی مشیروں کو پلاننگ بورڈ میں متعین کیا گیا۔ اس پلاننگ بورڈ نے پاکستان کی معاشی منصوبہ بندی کے لیے پہلا پنج سالہ منصوبہ تیار کیا۔ عالمی بنک کے چیئرمین واٹرسٹن نے اپنی کتاب (Planning in Pakistan) میں لکھا کہ پہلے پنج سالہ منصوبہ ہارورڈ گروپ نے تیار کیا تھا اور آدم کیرل نے اپنی کتاب (Planning for eduation in

Sanjh Lok Raj

(Pakistan میں لکھا کہ پہلے پنج سالہ منصوبے میں تعلیم کا باب جارج گرانٹ نے لکھا تھا۔ ہر صوبائی منصوبہ بندی ادارے میں بھی دو ہارورڈ کے مشیر مقرر کیے گئے۔ لہٰذا پہلے پنج سالہ منصوبے کی تکمیل کے لیے امریکہ نے 66.64 کروڑ ڈالر کی امداد منظور کی۔ اس سے پہلے کہ یہ منصوبہ مکمل ہوتا بری فوج کے کمانڈر ایوب خان نے امریکہ سے واپسی پر ملک میں فوجی آمریت قائم کردی۔ امریکہ کو خفیہ فوجی اڈے دیئے اور پاکستان کے معاشی مستقبل کا فیصلہ کرنے میں امریکی مشیروں کو مزید اختیارات دے کر پلاننگ بورڈ کی تنظیم نو کر کے اسے پلاننگ کمیشن کا نام دے دیا گیا۔

پلاننگ کمیشن (1958-1971)

جدید نو آبادیاتی نظام میں بھی سابقہ سامراجی نظام کی طرح معیشت کو زراعت پر جامد رکھنے کا منصوبہ بنایا گیا تا کہ زرعی ملک صنعتی ممالک کی منڈی رہیں۔ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے ایوب خان نے ''سبز انقلاب'' کا نعرہ دیا۔ جیسا کہ ہم نے مالیاتی سرمایہ کے دور میں دیکھا کہ نقد روپیہ کا بہاؤ کیا کردار ادا کرتا ہے کے ساتھ سبز انقلاب سے موافقت کی ایک مثال۔ پاکستان کے کسان امریکی ٹریکٹر فورڈ میسی فرگوسن اور امریکی کیمیائی کھادیں خرید کر ایوب خان کے سبز انقلاب میں شریک ہونے کی سکت نہیں رکھتے تھے۔ ان کی قوت خرید کمزور تھی۔ ادھر امریکی کمپنیوں کے پاس ٹریکٹروں، زرعی مشینری، کھادیں اور کیڑے مار دواؤں کی فالتو پیداوار گوداموں میں پڑی خریدار کا انتظار کر رہی تھی۔ امریکی ماہر زراعت پاکستان میں سبز انقلاب کے بانی لیسٹر براؤن نے اپنی کتاب (Seeds of change) میں لکھا کہ ''امریکی حکومت اور عالمی بنک نے پاکستان پر دباؤ ڈالا کہ وہ زراعت میں ترقی کے لیے امریکی سرمایہ کاری کرے۔ اس کے لیے امریکی ادارہ برائے بین الاقوامی ترقی کی طرف سے قرضہ کے ساتھ زرعی بنک بنایا گیا۔ جو کسانوں کی زمین رہن رکھ کر انہیں امریکی مصنوعات خریدنے پر پابند کرتا تھا۔ اس طرح قرضے کی رقم زرعی آلات کھادیں خریدنے کے عوض امریکہ واپس چلی گئی، فالتو مال فروخت ہو گیا، اور سود ابھی کسان کے سر باقی ہے۔ یعنی ہر لحاظ

Sanjh Lokraj

سے امریکہ ہی کو فائدہ ہوا۔1965-66 سے چار سال تک کیمیائی کھاد کی درآمد 4.12 کروڑ ڈالر تک ہوگئی۔

پلاننگ کمیشن کا مقصد تو یہ بتایا گیا کہ وہ سرکاری شعبے میں صنعت کاری کو فروغ دینے کے لیے بنایا گیا ہے۔مگر یہ ادارہ نجی شعبے میں غیر ملکی سرمایہ کاری کو فروغ دینے کے کام آیا اور اس طرح جو صنعت کاری بھی کی گئی وہ پیداواری قوتوں کو آگے بڑھانے کی بجائے الٹا سامراج کی بین الاقوامی معیشت میں ہمارے ملک کی محتاج حیثیت کو مستحکم کرتی رہی۔

منصوبہ بندی کمیشن کو ملنے والی تکنیکی امداد صرف ہارورڈ، عالمی بنک، فورڈ فاؤنڈیشن اور راک فیلر فاؤنڈیشن کے مشیروں کی صورت ہی میں نہیں ملتی تھی بلکہ پاکستان میں ایسے تعلیمی ادارے قائم کیے گئے جن میں ایسے پاکستانی ماہرین معاشیات تیار کیے جانے لگے جو سامراجی مفادات کے تابع پالیسیاں تیار کریں اور سرمایہ داری نظام کو فطرت کے اصولوں کے عین مطابق اور اسلامی تعلیمات سے ہم آہنگ ثابت کریں۔

پی۔آئی۔ڈی۔سی

Pakistan institute of development Economics

معاشیات کے علم میں جدید سامراجی ڈھنگ سے تحقیق کروانے کی غرض سے فورڈ فاؤنڈیشن کی مالی مدد سے پی۔آئی۔ڈی۔سی کا ادارہ قائم کیا گیا۔ اس ادارے کے پہلے ڈائریکٹر ایمیل ڈیس پرے تھے جو جے فیڈر کی کتاب (Who's who in CIA) کے مطابق امریکی جاسوس ثابت ہوئے۔ غیر ملکی ماہرین جو اس ادارے کے سربراہ رہے وہ سرمایہ داری معیشت کے علاوہ کسی اور معاشی سائنس کا علم نہیں رکھتے تھے۔اس ادارے کے ذریعے جدید سامراج مقامی لوگوں کو اپنے مقاصد کی تکمیل کے لیے تیار کر کے ملک کی معیشت کو بالواسطہ طور پر اپنے قبضے میں رکھ سکتا تھا۔

آئی۔پی۔بی۔اے

Instiitute of Public and business administration.

کراچی یونیورسٹی میں کامرس کا شعبہ بند کر دیا گیا اور نئے ادارے میں امریکی طرز کا نصاب رائج کیا گیا۔ اس ادارے میں(MBA) کے ڈگری یافتہ امیدواوں کو نجی کمپنیوں

Sanjh Lok Raj

میں ہاتھوں ہاتھ لیا جانے لگا۔ ایسے ماہرین معاشیات تیار کیے جاتے تھے جو جسمانی طور پر پاکستانی ہوں اور ذہنی طور پر سامراج کے مفادات کے محافظ۔ کئی مثالیں دی جا سکتی ہیں۔ ایوب دور میں محمد شعیب جو پاکستان کے وزیرخزانہ تھے عالمی بنک کے اعلیٰ افسر تھے۔ وہ اپنے عہدے سے مستعفی ہوئے بغیر ہی وزیرخزانہ کا کام سرانجام دیتے رہے۔ ڈاکٹر محبوب الحق جو منصوبہ بندی کمیشن کے چیف اکنامسٹ تھے پاکستان کی معیشت کو جدید سامراج کا محتاج رکھنے میں اہم کردار ادا کیا ضیاء الحق کے دور میں عالمی بنک سے آئے تھے۔ جنہوں نے اپنی کتاب میں سامراجی مقاصد کا پرچار کیا کہ اقتصادی ترقی کی خاطر سماجی بھلائی جیسے تعلیم اور صحت کے کام حکومت کو ترک کرنا ہوں گے اور انہیں پرائیویٹ سیکٹر کو سونپنا ہوگا۔ پھر معین قریشی کی صورت میں عالمی بنک سے نگران وزیراعظم اور سٹی بنک کی طرف سے شوکت عزیز بطور مستقل وزیراعظم ارسال کیے گئے۔ پاکستانی معیشت کو سامراج کے مفادات اور نظریہ کے تابع رکھنے کے لیے عزیز محمد کو جو IMF کے مستقل ملازم تھے پاکستان میں کئی مرتبہ عہدوں پر فائض کیا گیا۔

پلک

Pakistan Industrail credit and investment corporation

عالمی بنک کی طرف سے پاکستان میں صنعتی قرضے اور سرمایہ کاری کی کارپوریشن کا قیام عمل میں لایا گیا۔ یہ ادارہ پاکستان کے نجی سرمایہ داروں کو غیرملکی اور سرکاری امداد فراہم کرنے کا ذریعہ ہے۔ اس ادارے نے غیرملکی امداد اور حکومتی قرضے سے گماشتہ سرمایہ دار طبقہ پیدا کیا جو سرمایہ دارانہ سسٹم کے نگران کے طور پر پیدا کیا گیا۔

آئی۔ڈی۔بی۔پی

Industrail development bank of Pakistan

صنعتی بنک کا کام تھا کہ سرمایہ دار طبقہ کو قرضے دے اور پھر انہیں معاف کر دے ان میں سے زیادہ تر لوگ وہ بھی تھے جو جاگیردار سیاستدان تھے انہیں ہر آنے والے حکمران کے ساتھ ملنے اور سابقہ حکمران سے دھوکہ کرنے کے عوض نوازا جاتا تھا۔ چند نام یہ ہیں۔

Sanjh Lok Raj

حبیب شوگر مل	اسمٰعیل سیمنٹ
ولیکا کیمیکل انڈسٹریز	پیکجز لمیٹڈ
آدم جی انڈسٹریز	پاک پیپر کارپوریشن
کوہ نور لمیان ملز	پاکستان ریفائنری لمیٹڈ
ذیل پاک سیمنٹ فیکٹری	
حسین شوگر مل	
فوجی شوگر مل	

آئی۔اے۔سی۔پی۔

Invesment Advisary Centre of Pakistan

غیر ملکی نجی سرمایہ کاری کے لیے راہ ہموار کرنا۔

غیر ملکی سرمایہ کاری کے امیدواروں اور پاکستان میں پہلے سے موجود غیر ملکی سرمایہ کاروں کے لیے رکاوٹ پیدا کرنے والے حالات کا جائزہ لینا۔

چیمبر آف کامرس۔انویسٹمنٹ پروموشن بیورو۔مینجمنٹ ایسوسی ایشن کی سرگرمیوں کو امداد دینا۔ یہ بات سمجھنی ضروری ہے کہ جب بھی کسی ملک کے ساتھ ہمارے معاشی تعلقات قائم ہوتے ہیں اور ہم ان سے امداد طلب کرتے ہیں تو وہ ہمیشہ اس امداد کے بدلے میں اپنی تجارت کے لیے سہولیات حاصل کرنے کی شرائط رکھتا ہے خواہ وہ امریکہ ہو یا چین۔

Sanjh Lok Raj

بھٹو کا سوشلزم
1971-1977

سوشلزم بنیادی طور پر ذرائع پیداوار کی سماجی ملکیت کا نام ہے۔ سرمایہ داری کے عروج کے دور میں جب تمام وسائل اور دولت چند ہاتھوں میں سکڑنے کی وجہ سے بہت بڑی آبادی بنیادی ضروریات سے محروم ہوگئی، اس تضاد کے حل کے لیے سوشلسٹ سسٹم وجود میں آیا۔ مگر سماجی علوم کے ارتقاء کے نتیجے میں یہ ثابت ہوگیا کہ پسماندہ ممالک میں بھی منصوبہ بند معیشت کے ذریعے سوشلسٹ معیشت کو پروان چڑھایا جا سکتا ہے۔ لیکن منصوبہ بند معیشت کے ذریعے کسی پسماندہ ملک کو دنیا کے ترقی یافتہ ممالک کی صف میں شامل کرنے کے لیے ایک طبقاتی پارٹی کی ضرورت ہوتی ہے۔

پاکستان میں ذوالفقار علی بھٹو کے سوشلزم کا تجزیہ کرنے کے لیے قیام پاکستان سے اب تک کے سیاسی و معاشی حالات کا جائزہ لینا ضروری ہے۔ پاکستان میں ذرائع پیداوار کے مالک کالونیل جاگیردار تھے جنہیں برطانوی سامراج نے ملک کی معیشت کو زراعت پر جامد رکھ کر انہیں صنعتی ممالک کی مصنوعات کی منڈی رکھنے کے لیے پیدا بھی کیا تھا اور انہیں سیاسی قیادت کے طور پر پروان بھی چڑھایا تھا۔ بھٹو کا تعلق بھی اسی طبقے سے تھا۔

ذرائع پیداوار کے دوسرے مالک گماشہ سرمایہ دار تھے۔ یہ وہ لوگ تھے جنہیں سرکاری قرضوں اور غیر ملکی سرمایہ داروں کی شراکت سے پروان چڑھایا گیا تھا۔ جس کے لیے سامراجیوں نے پلاننگ کمیشن پر پہلے دن سے قبضہ کر لیا ہوا تھا۔ اور (PICIC) کے ساتھ ساتھ (IACP) کی مدد سے حکومت نے غیر ملکی سرمایہ کاری اور گماشتہ سرمایہ کاری کے تحفظ کے لیے قانون سازی کی ہوئی تھی۔

Sanjh Lok Raj

ذرائع پیداوار پر قابض تیسری قوت غیر ملکی سرمایہ دار تھے۔ غیر ملکی سرمایہ داری کو جو سہولیات حاصل تھیں وہ یہ ہیں۔

1۔ غیر ملکی سرمایہ دار جب چاہیں اپنے سرمایہ کی پوری رقم اپنے ملک کے زرمبادلہ میں واپس لے جا سکتے ہیں۔

2۔ غیر ملکی سرمایہ دار منافع کو پاکستان سے باہر لے جا سکتے ہیں۔

3۔ اپنے منافع کی دوبارہ سرمایہ کاری کر سکتے ہیں۔

4۔ جو غیر ملکی سرمایہ دار اپنے ملکوں میں ٹیکس ادا کر رہے ہیں وہ پاکستان میں دوبارہ ٹیکس ادا نہ کریں۔

5۔ غیر ملکی سرمایہ داروں کو ٹیکس کی وہ تمام رعائتیں ہوں گی جو پاکستانیوں کو حاصل ہیں۔

6۔ درآمد اور برآمد کے قوانین غیر ملکی سرمایہ داروں اور پاکستانیوں کے لیے یکساں ہوں گے۔

7۔ غیر ملکی صنعتوں کو قومی تحویل میں نہیں لیا جائے گا۔

ذرائع پیداوار کے مالک چوتھی قوت پاکستان کی ابھرتی ہوئی قومی سرمایہ داری تھی۔ یہ ابھی اپنی بچپن کی منزل میں تھی۔ ان میں دھان چھڑنے کی مشینیں۔ کپاس بیلنے کے کارخانے گھی ملیں۔ سیمنٹ کے کارخانے تھے ان میں کوئی بھاری صنعت موجود نہیں تھی۔ کسی ملک میں قومی سرمایہ دار ہی ملک کی معیشت کی ریڑھ کی ہڈی ہوتا ہے۔ دنیا میں بادشاہت کا خاتمہ، آئین و قانون کی بالادستی، ریاست کا ادارہ جمہوریت، سیاست، تعلیم اور علاج وغیرہ کا ریاست کی زمہ داری میں ہونا یہ سب کچھ قومی سرمایہ داروں کی بدولت وجود میں آیا۔ یورپ میں قومی ریاستوں کا قیام اسی قومی سرمایہ دار کا مرہون منت ہے۔ قومی سرمایہ داروں نے اپنے اپنے ممالک میں جاگیرداری کا خاتمہ کر کے پیداواری قوتوں کو آگے بڑھایا۔ یعنی جس ملک میں قومی سرمایہ دار پنپے گا وہ جاگیرداری کی رکاوٹ دور کر کے ہی اپنے ملک کے سیاسی اقتدار پر قابض ہونے کی ارتقائی منزل کی طرف گامزن ہوگا۔ تاریخ بتاتی ہے کہ قومی سرمایہ دار ہمیشہ جاگیرداروں کے معاشی وجود اور سیاسی اقتدار کے لیے خطرہ رہا ہے۔

Sanjh Lok Raj

جنوری 72ء میں ذوالفقار علی بھٹو نے سوشلزم کے نام پر 33 صنعتیں قومیا لیں۔ قومیانے کا لفظ چونکہ ہماری سیاست اور معیشت کی کتابوں میں استعمال ہوا ہے اس لیے ہم نے بھی یہ لفظ استعمال کیا ہے۔ حالانکہ ذوالفقار علی بھٹو نے یہ 33 صنعتیں بیوروکریسی کی تحویل میں دے دیں۔ کسی غیر ملکی کمپنی کو قومی تحویل میں نہیں لیا گیا۔ کسی جاگیردار کی زمین کو نہیں چھیڑا گیا۔ تجارتی بنک قومیائے گئے مگر ان بنکوں کو مستثنیٰ قرار دیا گیا جن میں غیر ملکی سرمایہ لگا ہوا تھا۔ پاکستان کی ابھرتی ہوئی سرمایہ داری کو اس کے بچپن ہی میں کچل دیا گیا۔ ان سرمایہ داروں کو تھانوں میں بے آبرو کیا گیا اور ٹیلیویژن پر ہتھ کڑیاں لگا کر پیش کیا گیا۔ اس وجہ سے آئندہ کئی سالوں کے لیے غیر ملکی سرمایہ داروں اور جاگیرداروں کی پاکستان پر قبضہ رکھنے کی عمر لمبی ہو گئی۔ جاگیرداری کا مستقبل محفوظ ہو گیا۔ اس طرح سرکاری اعداد و شمار کے مطابق 75-1974ء میں 71-1970ء کی نسبت تین گنا زرمبادلہ اشیائے صرف کی درآمد پر خرچ کیا گیا۔ 75-1974ء میں دو سو کروڑ کا تجارتی خسارہ ہوا۔ (یہ اعداد و شمار عالمی بنک کے ہیں)۔

ذوالفقار علی بھٹو کے سوشلزم نے جدید سامراج کی پالیسیوں کو آگے بڑھایا۔ اگرچہ بھٹو کے ایسے اقدامات بھی تھے جو سامراجیوں اور ان کے پٹھو فوجی جرنیلوں کو پسند نہیں آئے۔ مگر یہاں ان کا ذکر بے محل ہو گا۔ کیونکہ ہمارا موضوع اس بات کا متقاضی ہے کہ کیا بھٹو کے دور میں قومی پیداواری قوتوں کو آگے بڑھنے کا موقع ملا؟ تو جواب ہے نہیں۔

Sanjh Lok Raj

ضیاء الحق کا دورِ حکومت
معاشی پالیسی (1977-1998)

جیسا کہ آپ نے سمجھ لیا ہوگا کہ ہماری غربت اور پسماندگی کوئی فطری بات نہیں نہ ہی یہ ہمارے سماجی ارتقاء کی کوئی لازمی منزل ہے بلکہ اس کی مادی وجہ سامراجی تسلط ہے۔ جس کی بدولت ہمارا معاشی ڈھانچہ اس طرح تشکیل دیا گیا تھا کہ وہ زراعت پر جامد رہ کر عالمی سامراجی معیشت کا ایک مفلوج اور محتاج حصہ بن کر رہ جائے۔ یہ عمل لازمی طور پر کسی سازش کے نتیجے میں نہیں ہوتا بلکہ سرمایہ داری کا دم چھلہ بننے کا منطقی نتیجہ ہوتا ہے۔ برطانوی سامراج نے یہاں قبضہ کے دوران نہ صرف یہ کہ ہمارا معاشی ڈھانچہ تشکیل دیا بلکہ یہاں پر ایسے طبقات بھی پیدا کیے جن کے مفادات سامراج سے جڑے ہوئے تھے۔ اور انہیں سیاسی متبادل قیادت کے طور پر پروان بھی چڑھایا۔ مگر جدید سامراجی تسلط اور استحصال کی نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ سامراج اور مقامی استحصالی طبقوں کے مفادات اس قدر ہم آہنگ ہو جاتے ہیں کہ محکوم ملک کی پسماندگی خود مقامی حکمران طبقے کے مفاد میں ہو جاتی ہے۔

ذوالفقار علی بھٹو نے کئی معاملوں میں امریکہ کو ناخوش بھی کیا ہوا تھا۔ جیسے اسلامی سربراہی کانفرنس ایٹمی پروگرام، روس سے سٹیل مل لینا اور چین سے تعلقات وغیرہ۔ اندرون ملک بھٹو نے جاگیرداری کو ختم نہیں کیا، بس ان کے سر پر مسلسل زرعی اصلاحات نام کی تلوار لٹکائے رکھی جو اس نے کبھی پھینکی بھی نہیں تھی۔ مگر خوفزدہ جاگیردار طبقہ، فوج، جسے بھٹو نے عبرتناک شکست کے بعد دوبارہ طاقتور بنا دیا تھا، ابھرتا ہوا سرمایہ دار طبقہ جس نے اپنی ذاتی ملکیت کی بحالی کو نظام مصطفیٰ کے نام سے متعارف کروالیا تھا، بیوروکریسی اور عدالتی بیوروکریسی کے گٹھ جوڑ سے ضیاء الحق نے حکومت پر قبضہ کرلیا۔ مگر یہ سمجھنا غلط ہوگا کہ ضیاء الحق نے محض اندرونی حالات کی وجہ سے اپنے ہی ملک پر قبضہ کرلیا۔ اسے مکمل طور پر سامراجی

Sanjh Lok Raj

آشیر باد حاصل تھی۔ اس کا دور ملک میں سامراجی تسلط کے استحکام کا دور تھا۔ پاکستان کو عالمی سرمایہ داری کے لیے عالمی منڈی کا حصہ بنانے میں جتنی ریاستی رکاوٹیں تھی وہ ضیاء الحق نے دور کر دیں۔ اپنے ملک کے معاشی سسٹم کو سامراجی معاشی مفادات کے موافق بنانے کی اکھاڑ پچھاڑ کو(Structural Adjustment) کا پروگرام کہتے ہیں۔ اس اصطلاح کی تفصیل انٹرنیٹ پر بے شمار ویب سائٹوں پر بھی میسر ہے مگر ہم اس کا خلاصہ پیش کریں گے۔

سامراج سے ساختی مطابقت
(Structural Adjustment Programes)

ملکی معاشی پالیسیوں کو سامراجی معاشی مفادات کے موافق بنانے کو سٹرکچرل ایڈجسٹمنٹ کہتے ہیں۔ جب کوئی ملک آئی۔ ایم۔ ایف یا عالمی بنک سے قرضہ لیتا ہے تو اسے لازمی طور پر ایسی شرائط میں باندھ دیا جاتا ہے کہ جس سے وہ ملک اپنے معاشی ڈھانچے میں ایسی تبدیلیاں لانے کا پابند ہوتا ہے جس سے عالمی بنک کو رقم کی واپسی آسان ہو۔

اندرون ملک اپنی معاشی ساخت میں جو تبدیلیاں لائی جاتی ہیں وہ پرائیوٹائزیشن، ڈی ریگولیشن اور لبر لائزیشن ہیں۔ ان کے ذریعے ملک کو فری مارکیٹ بنایا جاتا ہے۔ Liberalisation Deragulation Privatization یعنی ایسی آبادی جو قوت خرید رکھتی ہو اور وہ محض سامراجی مصنوعات کو خرید کر زندگی گزارے۔ مقروض ریاست ایسی تمام قانون سازی ختم کرے جو عالمی تجارت کے راستے میں رکاوٹ بنے۔ عالمی بنک کے کاغذوں میں مقروض اور پسماندہ ملک کی معاشی پالیسیوں کو سامراجی مفادات کے تابع کرنے کو ساختی موافقت(Structural Adjustment) کہتے ہیں۔ جبکہ ضیاء الحق نے اس سارے عمل کو اسلامائزیشن کا نام دیا۔ اس کے ساتھ ساتھ میڈیا اور نظام تعلیم کو سامراج کے مطابق ڈھلنے کے عمل کو اسلامی نظام کی تکمیل بتانے پر لگا دیا۔

Sanjh Lok Raj

ساختی مطابقت۔ پرائیویٹائزیشن

اپنے ملک کی معیشت کو سامراجی مفادات کے مطابق ڈھالنے کا جواز پیدا کرنے کے لیے ایک آئیڈیالوجی ترتیب دی گئی اور اسے لازمی مضامین کے طور پر میٹرک کی سطح سے یونیورسٹی تک نافذ کر دیا گیا۔ اس آئیڈیالوجی کے مطابق پاکستان اس دن وجود میں آ گیا تھا جب پہلا ہندوستانی مسلمان ہوا تھا۔ پاکستان کی تاریخ کو مسلمانوں کے عروج و زوال کی تاریخ بنا کر پیش کیا گیا۔ ہندوستان پر مسلمانوں کی ایک ہزار سالہ حکومت کو غلبہ اسلام اور انگریزوں کے ہندوستان پر قبضہ کو امت مسلمہ میں اخلاقی کمزوری آ جانے اور دین سے دوری کی بناء پر انحطاط پذیر ہونا قرار دیا گیا۔ ہندوستان کی آزادی کی تحریک کو ہندو اکثریت کے غالب آنا اور عیسائی ہندو گٹھ جوڑ قرار دیا گیا۔ جبکہ تحریک پاکستان نہ صرف ہندوستان کے مسلمانوں کے لیے الگ وطن حاصل کرنا تھا بلکہ عالم اسلام کے لیے ایک قلعہ بنانا تھا۔ اور بالآخر یہ ثابت کیا گیا کہ پاکستان کا مطالبہ ایک ایسا خطہ زمین حاصل کرنا تھا جہاں ہم اسلام کے اصولوں کے مطابق زندگی گزار سکیں۔ اس میں معیشت کا کوئی ذکر نہیں کہ اسلام کے اصولوں کے مطابق معیشت سامراجی مفادات کے تابع ہو یا خود انحصار؟ کیونکہ ضیاء الحق کا اسلام تو صلوٰۃ کمیٹیاں۔ ذکوٰۃ آرڈیننس۔ رمضان آرڈیننس۔ مجلس شوریٰ۔ غیر جماعتی اسمبلی اور اسلامی سزاؤں کے نفاذ تک محدود تھا۔ اس طرح خوف و ہراس کی فضا پیدا کر کے ضیاء الحق نے مرحلہ وار سامراجی منشاء کے مطابق ملک میں سٹرکچرل ایڈجسٹمنٹ کا پروگرام شروع کیا۔

جولائی 1977ء میں نجی سرمایہ کاروں کا اعتماد حاصل کرنے کے لیے ضیاء حکومت نے ایک پروگرام شروع کیا جسے Denationalization اور(Disinvestment) کا نام دیا اور ستمبر 1977ء میں زرعی شعبہ سے متعلقہ دو ہزار صنعتی یونٹ نجی شعبہ کے حوالے کر دیے۔

ستمبر 1978ء میں ایک حکم کے ذریعے وفاقی حکومت کو اختیار دیا گیا کہ وہ (PICIC) کے ذریعے بھٹو کی بیوروکریسائی گئی صنعتوں میں گھاٹے والے صنعتی یونٹوں کو ان کے مالکوں کو واپس کرے۔ جس میں اتفاق فاؤنڈری۔ نوشہرہ انجینیر نگ اور ہلال و یجیٹیبل کو واپس کیا گیا۔ اس کے بعد رفتہ رفتہ سیمنٹ کھادیں اور بناسپتی گھی کو نجی شعبہ میں دے دیا گیا۔

Sanjh Lok Raj

1979ء سے 1985ء تک ضیاء الحق افغان جہاد کو کمانڈ کرتا رہا۔ بھٹو کو پھانسی لگ گئی۔ لوگوں پر کوڑے برسائے جاتے رہے یہاں تک کہ 1985ء آ گیا۔

1988ء میں بے نظیر برسر اقتدار آئیں تو انہوں نے نجکاری کی ساری کمیٹیوں کو آپس میں ضم کر کے ایک ہی کمیٹی بنا دی اور برطانوی فرم(N.M. Rothschild) کو بھاری تنخواہ پر نجکاری کے لیے مشیر مقرر کیا۔ انہوں نے PIA کے 10 فیصد حصص پاک سعودی فرٹیلائزر کے 40 فیصد حصص اور مسلم کمرشل بنک کے 60 فیصد حصص نجکاری کے لیے سفارش کی۔ جبکہ وہ صرف PIA کے 10 فیصد حصے نجی شعبہ کو فروخت کر سکے اور غلام اسحاق خان نے اسمبلی توڑ دی۔

1988ء ہی میں نواز شریف نے پرائیویٹائزیشن پنجاب کے سربراہ کی حیثیت سے پسرور شوگر مل۔ سمندری شوگر۔ راہوالی شوگر۔ پارس ٹیکسٹائل۔ ہڑپہ ٹیکسٹائل اور غازی ٹیکسٹائل کو فروخت کیا۔ مگر آج تک یہ پتہ نہیں چل سکا کہ کتنے میں فروخت کیا۔ مئی 1991ء کے ڈان میں چھپی رپورٹ کے مطابق پسرور شوگر مل ایک روپے میں یونائیٹڈ شوگر مل گروپ کو فروخت کی گئی۔

1992ء سے 1993ء تک 120 بلین روپے کی نجکاری کی گئی۔ جس میں منشاء گروپ کو مسلم کمرشل بنک اور سیمنٹ کے پانچ کارخانے دیے گئے۔ شون (Schon) گروپ کو چائنہ فرٹیلائزر اور نیشنل فائبر فروخت کیے گئے۔ توکل گروپ کو بلوچستان کے ویلز اور نیا دور موٹرز فروخت ہوئی۔ ایک نامعلوم شخص سکندر جتوئی میٹرو پولیٹن سٹیل۔ ذیل پاک سیمنٹ اور شیخوپورہ رائس لے گیا۔ پرائیویٹائزیشن جو کہ 1991ء جنوری میں تشکیل دیا گیا تھا 65 یونٹ پرائیویٹائز کرنے میں کامیاب ہوا۔ اس طرح بہت سے یونٹوں کے نئے مالکوں نے ایک قسط ادا کی۔ مشینری اکھاڑ کر لے گئے اور اب تک اپنی باقی قسطوں کے متعلق کسی نے نہیں پوچھا۔ 1993ء میں غلام اسحاق خان نے یہ اسمبلی بھی توڑ دی۔ 1993ء سے 1996ء تک 46.17 بلین کی نجکاری ہوئی۔ بے نظیر بھٹو نے واپڈا کا سب سے بڑا پیداواری یونٹ کوٹ ادّو اپنے دوسرے دورِ حکومت میں فروخت کیا۔ اس دور میں 25 انڈسٹریل یونٹ ایک فنانشل انسٹی ٹیوشن۔ پی ٹی سی ایلکے حصّے فروخت کیے گئے۔

Sanjh Lok Raj

1997ء سے 1999ء تک یعنی نواز شریف کے دوسرے دورِ اقتدار میں 12 انڈسٹریل یونٹ 5.2 بلین روپے میں فروخت کر سکی۔ 1998ء میں نواز شریف نے کیبنٹ کمیٹی آف پرائیویٹائزشن معطل کر دی اور خود پرائیویٹائزشن بورڈ آف پاکستان کے سربراہ بن گئے۔ اور انڈس سٹیل پائپ۔ درگئی گھی انڈسٹری وغیرہ فروخت کیے۔

غیر جانبدار غیر ملکی اداروں کی رپورٹ کے مطابق 2008-1985 تک پرائیویٹائزشن کے عمل میں 3 ہزار بلین روپے کی کرپشن ہوئی۔ پرائیویٹائزشن کمیشن نے اس کا جواز یہ بتایا تھا کہ اس کے ذریعے قرض کی ادائیگی کی جائے گی اور غربت میں کمی کی جائے گی۔ قرض اب تک ڈیڑھ گنا ہو چکا ہے اور غربت میں کمی یہ ہوئی ہے کہ سٹیٹ بنک آف پاکستان کی رپورٹ کے مطابق 45 فیصد لوگ غربت کی لائن سے نیچے زندگی گزار رہے ہیں۔

2009ء کے بجٹ میں 70 ارب روپے بے نظیر انکم سپورٹ پروگرام کے ذریعے پاکستانیوں کو خیرات دی جائے گی۔

مہنگائی

آج آپ پاکستان میں غذائی قلت۔ مہنگائی اور بجلی کا جو بحران دیکھ رہے ہیں وہ پرائیویٹائزشن کی وجہ سے ہے۔ فرض کریں کہ 20 کارخانے حکومت کے ہوں جنہیں پبلک سیکٹر کہتے ہیں اور 80 کارخانے نجی ملکیت یعنی سرمایہ داروں کے ہوں تو ایسی صورت میں یہ پبلک سیکٹر کے کارخانے ایک طرح سے حکومت کے پاس قیمتوں کو اپنے کنٹرول میں رکھنے کا ہتھیار ہوتے ہیں۔ مثلاً چینی اور گھی ہی کو لیجیے۔ حکومت پاکستان کے پاس گھی کارپوریشن آف پاکستان کے نام سے گھی کے کارخانے موجود تھے۔ جو مختلف حکومتوں نے پرائیویٹ مالکان کو فروخت کر دیے حکومت کے پاس شوگر ملیں تھیں جو کہ اونے پونے داموں سرمایہ داروں کو فروخت کر دی گئیں۔

جب کچھ کارخانے حکومت کے ہوں تو حکومت ان کی پیداوار کی قیمت مقرر کرے جیسا کہ اگر چینی کے 20 فیصد کارخانے پبلک سیکٹر میں ہوتے تو سپریم کورٹ کی طرف سے

Sanjh Lok Raj

40 روپے کلو چینی عوام کو فراہم کرنے میں حکومت کو مشکل نہ ہوتی اب چونکہ حکومت کے ہاتھ میں کچھ بھی نہیں ہے سرمایہ دار مصنوعی قلت پیدا کر کے جتنی چاہے قیمت مقرر کر لیتے ہیں۔ بجلی کا بحران بھی بجلی کی پرائیویٹائزشن کی وجہ سے پیدا ہوا۔ پرائیویٹائزشن آئندہ کئی حکومتوں کو مہنگائی اور بحرانوں سے دوچار کرے گی۔ اب تک جتنے بحران پیدا ہوئے ہیں وہ پرائیویٹائزیشن کی وجہ سے ہوئے ہیں۔

ملٹی نیشنل کمپنیاں

مالیاتی سرمایہ کے دور میں صنعتی ممالک میں بنک بیمہ کمپنیاں اور صنعتوں کی اجارہ داری قائم ہوچکی تھی۔ ان اجارہ داریوں کا تصرف کالونیوں پر بھی تھا۔لیکن عالمی تجارت بھی ہوتی تھی۔ جیسے اگر برطانیہ میں جاپان کی ایسی مصنوعات فروخت ہورہی ہیں جو برطانیہ میں نہیں بنتی اور جاپان میں برطانیہ کی ایسی مصنوعات فروخت ہورہی ہیں جو جاپان میں نہیں بنتی تو صنعتی ملکوں کی کالونیوں میں بھی ایسی تجارت کی اجازت تھی۔ وہ کمپنیاں یعنی بزنس انٹر پرائزز جن کی سرگرمیاں کسی ایک ملک تک محدود نہ ہوں ملٹی نیشنل کمپنیاں کہلاتی ہیں۔ مالیاتی سرمایہ کے دور کی صنعتی اجارہ داریاں ہی ملٹی نیشنل کمپنیوں میں تبدیل ہوگئیں۔ یہی ملٹی نیشنل کمپنیاں ہمارے ملک میں یا کسی بھی ملک میں جو سرمایہ کاری کرتی ہیں اسے غیر ملکی سرمایہ کاری کہتے ہیں۔

دنیا کی 100 چوٹی کی ملٹی نیشنل کمپنیوں میں 11 برطانوی کمپنیاں ہیں۔ جن میں شیل(Shell) سب سے زیادہ تیل اور گیس پیدا کرنے والی کمپنی ہے۔ جو 128 ممالک میں کام کرتی ہے۔(RTZ) رائیو ٹینٹو رتک دنیا کے 40 ممالک میں معدنیات نکالتی ہے۔ یونی لیور(Unilever)۔ صابن، گھی، چائے، شیمپو جیسی گھریلو استعمال کی اشیاء اور تیار خوراک کی دنیا کی سب سے بڑی کمپنی ہے۔ آئی سی آئی(ICI) دنیا کے 30 ممالک پر قابض کیمیکلز کی کمپنی ہے جن میں رنگ روغن، دھوبی سوڈا، کھادیں اور دھماکہ خیز مواد بنانے والی سب سے بڑی کمپنی ہے گلیکسو ویلکم پوری دنیا میں کاروبار کرتی ہے۔

Sanjh Lokraj

دنیا کی 100 چوٹی کی ملٹی نیشنل کمپنیوں میں 33 امریکی اجارہ داریاں ہیں۔ جن میں کمپیوٹر سافٹ ویئر، موٹر انڈسٹری میں جنرل موٹرز اور فورڈ موٹرز، تیل کی صنعت پر ایکسون (Exxon)، ٹیکسیکو (Texcco)، موبل (Mobil) اور اموکو (Amoco) کا قبضہ ہے۔ کیمیا کی صنعت پر (Dupont) اور (Dow Chemical)، ہوائی جہازوں پر (Lockheed Martin) اور یونائیٹڈ ٹیکنالوجی کا اجارہ ہے۔ اس کے علاوہ اسلحہ کی ساخت پر امریکہ کا اجارہ ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ خوراک اور زراعت پر امریکہ کا اجارہ ہے۔

دنیا کی 100 چوٹی کی ملٹی نیشنل میں35 کا تعلق جاپان سے ہے۔ جن کا ٹرانسپورٹ، الیکٹرانکس، ٹیلی کمیونیکیشنز، ٹی وی، فریج، بیٹریاں، ہمارے گھروں میں ہر دوسری چیز جاپان کی ہے یا چین کی۔

اس کے علاوہ آسٹریلیا، سویٹزرلینڈ، فرانس، جرمنی، کوریا اور دیگر ممالک کی ملٹی نیشنل کمپنیاں پاکستان میں اپنی مصنوعات فروخت کررہی ہیں۔ یہاں تک کہ بسکٹ، ٹافیاں، چائے، بوتل اور برگر تک تو ہم غیر ممالک کا استعمال کرتے ہیں۔ضیاء الحق اور اس کے بعد اب تک کا دور پاکستان پر ملٹی نیشنل کمپنیوں کے قبضے کا دور ہے۔1988ء سے 2000 تک ورلڈ بنک اور آئی ایم ایف کے حکم پر پاکستانی حکومتوں نے سرکاری سطح پر قانون سازی کے ذریعے ملٹی نیشنل کمپنیوں کے نئے نو آبادیاتی دور کی پیش قدمی کا راستہ ہموار کیا۔

ملٹی نیشنل کمپنیوں کے بارے میں سید عظیم نے اپنی کتاب ''ملٹی نیشنل کمپنیاں'' میں یہ تجزیہ کیا ہے۔

(1) ملٹی نیشنل کمپنیاں ہمارے جیسے جس ملک میں سرمایہ کاری کرتی ہیں وہاں تھوڑے عرصے میں مقامی صنعت کا صفایا کر کے اجارہ داری قائم کرلیتی ہیں۔

(2) یہ مقامی صنعت کو آزاد مقابلے کے ذریعے خارج کر کے اپنی مرضی سے طلب اور رسد کو کنٹرول کرتی ہیں۔

(3) ملٹی نیشنل کمپنیوں کی ٹیکنالوجی ہمارے وسائل کے ہم آہنگ نہیں۔ یہ بیروزگاری پیدا کرتی ہیں۔

Sanjh Lokraj

(4) اس طرح چند لوگ امیر سے امیر تر اور باقی غریب سے غریب تر ہوتے جاتے ہیں۔

ملٹی نیشنل کمپنیاں ہی سامراج کا مادی وجود ہیں۔ جنہیں اب اپنے الگ الگ قومی مرکزوں کی بجائے عالمی سرمایہ داری کنٹرول کرتی ہیں۔

ساختی موافقت - ڈی ریگولیشن

یہ ایک مسلمہ اصول ہے کہ دنیا میں جہاں کہیں بھی صنعتی ترقی ہوئی اسے حکومت کی سرپرستی حاصل تھی۔ ایسے قوانین کے ذریعے جن سے غیر ملکی مصنوعات کا راستہ روکا جاتا رہا۔ ان قوانین کی مدد سے مقامی صنعت کو تحفظ دیا گیا۔ مثال کے طور پر کسی ملک میں مقامی سرمایہ دار تالے کا ایک کارخانہ لگا لے۔ اسے یہ تالا 20 روپے میں پڑتا ہو ادھر چین یا جاپان اسی ملک میں اپنا تالا 10 روپے میں فروخت کرے تو اس طرح مقامی صنعت تباہ ہو جائے گی۔ ایسی صورتحال میں حکومت ایک ایسا ٹیکس عائد کرتی ہے جس سے غیر ملکی مصنوعات قومی صنعت کے مقابلے میں مہنگی رہیں۔ اسے ٹیرف کہتے ہیں ایسی چیزیں جو ملک میں بن رہی ہوں ان کی درآمد پر پابندی لگا دے یا ان کا کوٹہ محدود کر دے۔ یا مقامی صنعتوں کو ٹیکس میں چھوٹ دے دے۔

پاکستان چونکہ ایک کالونیل معیشت کا حامل ملک ہے اس لیے اسے عالمی معیشت کے حاکموں کی ہر بات ماننی پڑتی ہے۔ مقروض ملکوں میں ملٹی نیشنل کمپنیوں کی مصنوعات کو سستا فروخت کرنے کی راہ میں رکاوٹ بننے والے مقروض ملکوں کے قوانین کو نرم کرنا یا بالکل ختم کرنا ڈی ریگولیشن کہلاتا ہے۔ تیسری دنیا کے ممالک میں ڈی ریگولیشن کے ذریعے مقامی صنعت کو سرمایہ دار ملکوں کی مصنوعات سے مقابلہ کروا کر دیوالیہ کیا جاتا ہے جس سے مقامی صنعت تباہ ہو جاتی ہے اور بیروزگاری و غربت میں اضافہ ہوتا ہے اس کو فری مارکیٹ اکانومی بھی کہا جاتا ہے یعنی تیسری دنیا کے ممالک کو صارفین کے معاشرے میں تبدیل کرنا۔ ضیاء الحق کے زمانے میں بتدریج پاکستان کی منڈی غیر ملکی درآمدات کے لیے کھولی گئی۔ ملٹی نیشنل کمپنیوں کو عروج

Sanjh Lok Raj

حاصل ہوا یہاں تک کہ برگر اور نمکو بھی غیر ملکی ہاتھوں میں چلے گئے۔ اِسی دور میں صنعت اور زراعت پر دی جانے والی سبسڈی ختم کی گئی۔ بجلی گیس اور پانی کے ریٹ مقرر کرنے کا اختیار آئی ایم ایف کو دیا گیا۔ برآمدات پر دی جانے والی مراعات ختم کی گئیں۔ قیمتی اثاثے فروخت ہونا شروع ہوئے۔ لیکن یہاں یہ عمل معاشیات کی اسلامائزیشن کے نام پر ہوا۔ یہ عمل مشرف کے دور تک جاری رہا۔ درمیان میں جو سیاسی حکومتیں آئیں انہیں حکومت اس شرط پر دی گئی کہ وہ عالمی مالیاتی اداروں کی پالیسیوں کو جاری رکھیں گے۔

ساختی موافقت - لبرلائزیشن

آزاد منڈی کی معیشت سرمایہ داری نظام کی وہ شکل ہے جس میں حکومت کے کنٹرول میں سوائے کرنسی اور دفاع کے کچھ نہیں ہوتا۔ لبرلائزیشن ویسے تو سابقہ حکومت کی معاشی پالیسی میں سامراجیوں کے حق میں نرمی کو کہتے ہیں مگر اس میں مقامی طور پر سرکاری زمینوں کو عام لوگوں کی رسائی میں لانا۔ محکموں کی ڈاؤن سائزنگ یا رائٹ سائزنگ۔ ملازموں کی برطرفیاں۔ گولڈن شیک ہینڈ سبھی ساختی موافقت کا نتیجہ ہے روپے کی قیمت میں کمی کرتے وقت ہمیشہ یہ بتایا جاتا ہے کہ اس سے برآمدات میں اضافہ ہوگا۔ آپ یہ سوچیں کہ جو ملک صرف زرعی رکھے جانے پر مجبور ہے اور جہاں ہمیشہ خوراک کا بحران ہے وہ کیا برآمد کرے گا۔ ایسا کرنے سے تجارت کا توازن تو کبھی ہمارے حق میں نہیں ہوا۔ البتہ ہر دفعہ پہلے سے موجود قرضوں کا بوجھ اور بڑھ جاتا ہے اور اندرون ملک جو اشیاء صابن، سرف، دوائیاں، مشینری باہر لے ممالک کی استعمال ہوتی ہیں۔ وہ مہنگی ہو جاتی ہیں۔

Sanjh Lokraj

مشرف دورِ حکومت
1998-2007

سماجی سائنس کا قانون ہے کہ ہر معاشی نظام مخصوص طبقوں کو پیدا کرتا ہے اور یہ طبقے مخصوص اداروں کو جنم دیتے ہیں۔ جیسے زرعی معیشت کے نظام میں جاگیردار اور مزارعہ کے طبقے ہوتے ہیں اور جاگیرداری ہمیشہ بادشاہت کے سیاسی نظام کو جنم دیتی ہے۔ اس طرح صنعتی نظام معیشت نے سرمایہ دار اور مزدور کے طبقے پیدا کیے اور سرمایہ داروں نے بادشاہیت کی بجائے جمہوری سسٹم کو جنم دیا۔ قانون یہ ہے کہ ہر معاشی سسٹم کا ایک اوپری ڈھانچہ یعنی سیاسی نظام ہوتا ہے جو اس خاص قسم کی معیشت کا محافظ ہوتا ہے۔ کالونیل سسٹم بھی ایک معاشی نظام ہے جس کا اوپری ڈھانچہ بیوروکریٹک سسٹم ہے یعنی بیوروکریٹک سیاسی نظام ہے۔ بیوروکریسی سول۔ فوجی اور عدالتی تین ذیلی اداروں پر مشتمل ہے۔ پاکستان کا اقتدار بھی 1947ء میں اِسی بیوروکریٹک تکون کو منتقل ہوا تھا۔ بیوروکریسی آج تک کالونیل معاشی نظام کا حفاظتی قلعہ ہے۔ نواز شریف نے اپنے دوسرے دور اقتدار میں آئینی ترمیم کے ذریعے اختیارات کا پلڑا وزیراعظم کے حق میں جھکا لیا۔ جس سے فوج وزیراعظم کے ماتحت ہوگئی۔ عدلیہ پر ویسے حملہ ہوا اور سول بیوروکریسی بھی خوفزدہ ہوگئی۔ یاد رہے کہ کالونیل معاشی نظام ان تین بیوروکریٹک اداروں کی سرپرستی کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔ ان آئینی ترامیم سے بیوروکریسی کی تکون کو جو نقصان پہنچا اس کی تلافی کے لیے اور انہیں خوف کی فضا سے نکال کر تازہ دم کرنے کے لیے پرویز مشرف نے حکومت پر قبضہ کر لیا۔ تاکہ سامراجیوں کو اپنا معاشی ایجنڈا آگے بڑھانے میں کوئی ہچکچاہٹ نہ ہو۔ بلکہ پھر آپ نے بعد میں دیکھا کہ شوکت عزیز اور اس کے ساتھ سامراجی خدمتگاروں کی ایک ٹیم جمہوریت اور مسلم لیگ کے نام پر حکومت کرتی رہی۔ اور اب یورپی

Sanjh Lokraj

یونین کے نیولبرل ایجنڈا اور امریکی سامراجی معاشیات کی گلوبلائزیشن کے ایجنڈ کو مشرف اور شوکت عزیز نے گڈ گورننس کے نام پر آگے بڑھایا۔

نیولبرل ازم

اسے اکنامک لبرل ازم کہا جائے تو زیادہ بہتر ہو گا۔ اب تک سوویت یونین میں کیمونسٹ حکومت کے خاتمے کے بعد یورپی اور دیگر سرمایہ دار حکومتیں فلاحی ریاست کے تصور سے دستبردار ہو چکی ہیں۔ اکنامک لبرل ازم کے تحت اب عام آدمی کی فلاح سے ریاست بے تعلق ہو چکی ہے۔ عام شہری کی ذاتی زندگی میں بنیادی ضرورتوں کی فراہمی کی ذمہ داری ریاست پر ہونے کا نظریہ جو کہ کینز (Keynes) کا نظریہ کہلاتا ہے۔ ردی کی ٹوکری میں پھینکا جا چکا ہے کیونکہ اب مقابلے میں کوئی سوشلسٹ ریاست موجود نہیں ہے۔ نیو لبرل ازم کا مطلب ہے۔ معاشی معاملات پر ریاستی مداخلت کا خاتمہ، تجارت پر ہر قسم کی روک کا خاتمہ، بیرونی مصنوعات پر ٹیرف کا خاتمہ، آزاد تجارت کے ذریعے عالمی منڈی کا قیام۔ پاکستان جیسے غلام نیم زرعی نیم قبائلی نیم صنعتی بناوٹ کے ملک میں نیولبرل ازم کا مطلب ہے غیر ملکی سرمایہ کار جتنا منافع چاہیں یہاں کی صنعت کو تباہ کر کے اور مقامی گماشتہ سرمایہ دار کے ساتھ مل کر اپنے ملک کو لے جائیں۔ نیولبرل ازم کے 5 فیچر۔

1۔ مارکیٹ کی حکمرانی

ریاست کی حکمرانی کی بجائے مارکیٹ کی طاقتوں کی حکمرانی۔ نجی سرمایہ اور نجی کاروبار پر سے ہر قسم کے ریاستی قوانین کا خاتمہ۔ غیر ملکی سرمایہ کاروں کو قانونی تحفظ فراہم کرنے کے ساتھ ساتھ بیرون ملک منافع منتقل کرنے کی چھوٹ۔ عالمی تجارت کے لیے اپنی منڈیوں کو غیر مشروط کھولنا۔ قیمتوں کے تعین پر ریاستی کنٹرول کا خاتمہ۔

Sanjh Lok Raj

2۔ ڈی ریگولیشن

ہر قسم کے وہ تمام ضابطے اور قوانین جو کسی غیر ملکی سرمایہ کار کے منافع کمانے اور اسے بیرون ملک منتقل کرنے کے راستے میں رکاوٹ بنتے ہوں ان کا خاتمہ۔ سرکاری محکموں میں کمی سرکاری محکموں کے عملے میں کمی۔ گولڈن شیک ہینڈ۔ چھانٹی۔ جبری ریٹائرمنٹ۔

3۔ پرائیویٹائزیشن

تمام قیمتی اثاثے خواہ وہ زمین کی شکل میں ہوں یا صنعت کی۔ بنک ہوں یا سکول۔ ہائی وے ہو یا پُل، ہسپتال ہوں یا سکول ان کو نجی ہاتھوں میں فروخت کرنا۔

4۔ سماجی خدمات کی ریاستی ذمہ داری کا خاتمہ

تمام سماجی خدمات جیسے صحت۔ تعلیم۔ روزگار۔ رہائش اور دیگر بنیادی ضرورتیں جن کا پورا کرنا ریاست کی ذمہ داری سمجھا جاتا تھا ان ذمہ داریوں سے ریاست کی دستبرداری۔ اسے گڈ گورننس بھی کہتے ہیں۔

کتابیات

1۔	شاہراہ انقلاب	ڈاکٹر مبشر حسن
2۔	ملٹی نیشنل کمپنیاں	سید عظیم
3۔	تاریخ کیا کہتی ہے	ڈاکٹر مبارک علی
4۔	سامراج اور پاکستان	ڈاکٹر فیروز احمد

Sanjh Lok Raj

C:\Documents and Settings\HAYYAT\Desktop\MASOOD KHALID-NEWSPAPER.jpg not found.

Sanjh Lok Raj

کارن تے ہونی
Cause and Effect

توں ای دس مینوں
کہ بے کارن وی مویا ہے کوئی ؟
بے وجہ گھاٹا پیا
نقصان ہویا ہے کوئی ؟
پیڑ دکھ باجھوں وی
نکلی ہاہ یاں رویا ہے کوئی ؟
جو وی ہویا اے اوہدا
کارن وی ہویا ہے کوئی
کارناں ماتحت ہی
ہونی دی چلدی کار ہے
کوئی کارن ہی
ہر اک ہونی دا ذمہ دار ہے
جے توں چاہندا ایں
کہ ایہہ ہونی بدل جائے تیری
دکھاں دے طوفان چوں
کشتی نکل جائے تیری
سجو مصیبت توں اٹل سمجھی اے

Sanjh Lok Raj

ٹل جائے تیری
لڑکھڑاندی ڈولدی
قسمت سنبھل جائے تیری
پھول ''جیون فلسفہ''
غلطی نکل جاسی ضرور
توں بدل کارن نوں
ہونی بدل جاسی ضرور

Sanjh Lok Raj